شذرات
اہل دعوت کا مسئلہ | منظور الحسن | ۲
قرآنیات
النساء (۴: ۴۴-۵۷) | جاوید احمد غامدی | ۵
معارف نبوی
تغییر بالید | طالب محسن | ۱۳
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنا | معز امجد | ۲۱
قسم توڑنے کا حکم | محمد رفیع مفتی | ۲۳
ذبح کا طریقہ | ساجد حمید | ۳۰
دین و دانش
ایمانیات (۱۷) | جاوید احمد غامدی | ۳۳
سیر و سوانح
بعثت اور دعوت دین کا آغاز | خالد مسعود | ۴۱
عمر فاروق رضی اللہ عنہ (۶) | محمد وسیم اختر مفتی | ۵۳
یسئلون
متفرق سوالات | طالب محسن | ۶۱
www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

منظور الحسن

اہل دعوت کا مسئلہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہمارے اہل دعوت کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دین کو اس کی کامل صورت میں پیش کرنے سے گریزاں ہیں۔ اس کے برعکس وہ اجزاے دین کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ عامۃ الناس کسی ایک جز کو مکمل دین تصور کرنے لگتے ہیں۔ان کے طرز عمل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دعوت، جہاد یا کسی دوسرے جز و دین کو مخصوص زاویۂ نظر کے تناظر میں مرکز ومحور بنایا جاتا ہے اور پھر فکر وعمل اور دعوت وتربیت کی تمام سرگرمیاں اس سے وابستہ کر دی جاتی ہیں۔علم وتحقیق کا کام اسی خاص جز کی تفصیل جاننے کے لیے کیا جاتا ہے،تصانیف اسی کی وضاحت کے لیے تالیف ہوتی ہیں، رسائل اسی کے ابلاغ کے لیے جاری ہوتے ہیں، درس گاہیں اسی کی تعلیم کے لیے قائم کی جاتی ہیں، جماعتیں اور تحریکیں اسی کے بارے میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے منظّم ہوتی ہیں،غرضیکہ دعوت کے تمام مظاہر اسی جز کی تفصیل کر رہے ہوتے ہیں۔ دین کے باقی اجزا کو اول تو بیان ہی نہیں کیا جاتا اور اگر کبھی ضرورت پیش آ جائے تو اس خاص جز کے لوازم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

دعوت، دین کا ایک جز ہے،مگر بعض اہل علم نے اسے اس طریقے سے پیش کیا ہے کہ یہ جز دین کے پورے وجود پر حاوی محسوس ہوتا ہے۔ ہر خاص وعام کو کار دعوت کا مکلّف قرار دیا جاتا ہے۔مگر ہر شخص، ظاہر ہے کہ اس کی صلاحیت اور استطاعت نہیں رکھتا کہ قرآن،سنت،حدیث اور فقہ کے علوم پر دسترس حاصل کر سکے اور انھیں تدریس، تقریر یا تحریر کے پیرائے میں لوگوں کے مختلف طبقات تک پہنچا سکے۔ چنانچہ دین کے مشمولات میں سے چند نکات پر دعوت دین کا عنوان قائم کر کے انھیں ہر کس و ناکس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔اس صورت حال کی سب سے نمایاں

مثال تبلیغی جماعت کا کام ہے۔ان کی دعوت چھ نکات پر مبنی ہے۔ان میں سے 'تصحیح کلمہ' سے مراد الفاظ کو صحت کے ساتھ زبان سے ادا کرنا ہے، 'تصحیح نماز' سے مراد کلمات نماز کو یاد کرنا ہے، 'تصحیح علم و ذکر' سے مراد فضائل کا مذاکرہ اور کلمات ذکر یاد کرنا ہے، 'تصحیح نیت' سے مراد چھ نکاتی پروگرام کی تبلیغ کے لیے نیت کرنا ہے، 'اکرام مسلم' سے مراد مسلمانوں کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آنا ہے اور 'تفریغ وقت' سے مراد متعین ایام کے لیے چھ نکات کی دعوت لے کر لوگوں کے پاس جانا ہے۔ یہ اجزا اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہو سکتے ہیں، مگر انھیں اس طرح پیش کرنا کہ یہ دین کی کلی دعوت قرار پائیں، دین کے لیے فائدے کے بجائے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

بعض علما جہاد کو دین کے اصل پیغام کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ دین کے اس جز کو وہ اس طریقے سے سامنے لاتے ہیں کہ ہر شخص جہاد و قتال ہی کو مکمل دین تصور کرنے لگتا ہے۔مسلمانوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ دین کی بقا اور تبلیغ و اشاعت اسی صورت میں ممکن ہے، جب دشمنان اسلام کے خلاف برسر پیکار رہا جائے۔اس راہ میں اگر دنیوی منزل نہ بھی حاصل ہو، تب بھی یہ خسارے کا سودا نہیں ہے، کیونکہ اخروی منزل تو بہر حال حاصل ہو کر رہے گی۔اس تناظر میں عام آدمی کو دین پر عمل کرنے کی بہترین صورت یہی نظر آتی ہے کہ وہ تمام معاملات زندگی کو ترک کر کے میدان جہاد کا رخ کرے اور جام شہادت نوش کر کے جنت میں اپنا مقام محفوظ کر لے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے بعض اسالیب دین میں اپنی اصل ہی کے لحاظ سے بے بنیاد ہیں، مگر اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم صرف اس پہلو کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ دین کو اس کے اجزا کے لحاظ سے پیش کرنا اس کی دعوت کے لیے نہایت ضرر رساں ہے۔اس طرز عمل سے یہ نتائج لازمی طور پر نکلتے ہیں:

اولاً، دین اپنی کامل صورت میں لوگوں کے سامنے نہیں آتا۔

ثانیاً، مسلم اور غیر مسلم، دونوں طبقات کسی خاص جز ہی کے پہلو سے دین سے متعارف ہوتے ہیں۔

ثالثاً، عامۃ الناس کی اکثریت مخصوص اجزاے دین ہی کو دینی اہداف سمجھ کر اختیار کرتی ہے۔

چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ دین کی دعوت پیش کرتے ہوئے دو امور کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ایک یہ کہ دین کو اپنی کامل صورت میں بحیثیت مجموعی پیش کیا جائے اور دوسرے یہ کہ دین کے ہر جز کو وہی وزن دیا جائے جو خود دین نے اسے دیا ہے۔زمانی یا مقامی مصالح کا خیال کر کے بعض اجزا کو اس طرح پیش نہ کیا جائے کہ دین کا اپنا قائم کیا ہوا توازن بگڑ جائے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل علم ان امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین کی دعوت پیش کریں۔ وہ لوگوں پر یہ واضح

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کریں کہ دین کی حقیقت اللہ کی بندگی ہے اور دینی زندگی سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے انفرادی اور اجتماعی وجود میں فکر و عمل کی تمام جہتیں اصلاً بندگی رب کے لیے متعین کرے۔ انھیں بتائیں کہ دین کا مقصود تزکیۂ نفس ہے اور جنت کے انعام کے مستحق وہی لوگ ہیں جو دنیا میں اپنے نفوس کو شیطانی آلایشوں سے پاک رکھنے کے لیے سرگرم عمل رہیں۔ انھیں یہ تعلیم دیں کہ دین محض اذکار اور رسوم کا نام نہیں ہے، بلکہ اس نے شریعت کی صورت میں عبادت، معاشرت، سیاست، معیشت، دعوت، جہاد، حدود و تعزیرات، غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی کے لیے بنیادی اصول و قوانین وضع کیے ہیں۔ ان کی پاس داری ضروری ہے اور ان کا انکار دین کے انکار کے مترادف ہے۔ اسی جامع اسلوب میں دین کی دعوت دین و دانش کا تقاضا ہے۔ اہل علم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دین کو پوری بصیرت کے ساتھ سمجھیں اور اسے بہ تمام و کمال لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

البیان
جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة النساء

(۱۳)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ، وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ
تَضِلُّوا السَّبِیْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِکُمْ، وَکَفٰی بِاللّٰهِ وَلِیًّا، وَّکَفٰی بِاللّٰهِ
نَصِیْرًا ﴿۴۵﴾

تم نے دیکھا نہیں[100] اُن لوگوں کو جو خدا کی کتاب سے بہرہ یاب ہوئے[101]؟ (اُن کے سامنے اُسی پروردگار کی یہ شریعت پیش کی جاتی ہے تو اِس کے مقابلے میں) وہ گمراہی کو ترجیح دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راستہ گم کر دو۔ تمھارے اِن دشمنوں سے اللہ خوب واقف ہے۔ (تم اِن کی پروا نہ کرو) اور (مطمئن رہو کہ) تمھاری حمایت کے لیے اور تمھاری مدد کے لیے اللہ کافی ہے۔۴۴-۴۵

---

[۱۰۰] اصل میں 'الم تر' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اسلوب مخاطبین کو فرداً فرداً متوجہ کرنے اور اظہار تعجب و افسوس کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

[۱۰۱] اصل الفاظ ہیں: 'الذین اوتوا نصیبًا من الکتاب'۔ ان میں 'من' بیان کے لیے ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کے حصے میں کتاب الٰہی آئی اور دنیا کی سب قوموں کو چھوڑ کر وہ اس سے نوازے گئے۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ، وَيَقُوْلُوْنَ: سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا، وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ، وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ، وَطَعْنًا فِی الدِّيْنِ، وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا: سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، وَاسْمَعْ، وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ، وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ

(پھر اِن میں سے بالخصوص) یہود کا ایک گروہ زبان کو توڑ موڑ کر اور دین پر طعن کرتے ہوئے[102] لفظوں کو اُن کے موقع و محل سے ہٹا دیتا ہے اور 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا'، 'اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ' اور 'رَاعِنَا' کہتا ہے۔[103] دراں حالیکہ اگر وہ 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'، 'اِسْمَعْ' اور 'اُنْظُرْنَا' کہتے تو اُن کے لیے بہتر ہوتا اور موقع و محل کے مطابق بھی۔[104] لیکن اُن کے منکر ہو جانے کے باعث اللہ نے اُن پر لعنت کر دی ہے، اِس لیے وہ کم

[۱۰۲] یہود کی جن شرارتوں کا ذکر آگے ہوا ہے، وہ سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز کے لیے ہیں، لیکن قرآن نے ان کو 'طعنًا فی الدین' (دین پر طعن) سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ دین و شریعت اور نبی کی شخصیت اصل میں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اس وجہ سے نبی پر طعن خود دین پر طعن کے مترادف ہے۔

[۱۰۳] یہ ان شرارتوں کی طرف اجمالاً اشارہ کیا ہے جو یہود کے اشرار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے ارادے سے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو دوسروں کی نگاہ میں حقیر اور بے وقعت بنانے کے لیے کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال عرب کے مجلسی الفاظ میں ان کی تحریف تھی جو متکلم کی تحسین، سننے والوں کی طرف سے ذوق و شوق اور اعتراف و قبول کے اظہار کے لیے بولے جاتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ الفاظ اصلاً تو اظہار تحسین یا اعتراف و قبول کے لیے ہیں، لیکن اگر کوئی گروہ شرارت اور بدتمیزی کرنا چاہے تو ذرا زبان کو توڑ مروڑ کر، تلفظ کو بگاڑ کر، یا لب و لہجہ میں ذرا مصنوعی انداز پیدا کر کے بڑی آسانی سے تحسین کو تقبیح اور اعتراف و اقرار کو طنز و استہزا بنا سکتا ہے۔ اس سے متکلم کے وقار کو کوئی نقصان پہنچے یا نہ پہنچے، لیکن شرارت پسند اشخاص اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۰۹)

[۱۰۴] استاذ امام امین احسن اصلاحی نے ان الفاظ کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے لفظی معنی ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ اہل عرب یہ اس موقع پر بولتے تھے جب اپنے کسی بڑے، کسی سردار، کسی بادشاہ کے حکم و ارشاد پر اپنی طرف سے امتثال امر کے لیے آمادگی اور مستعدی کا اظہار کرنا چاہتے۔ عربی میں اس کے لیے 'طَاعَة' کا لفظ بھی ہے جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہودی اشرار

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ، فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

ہی ایمان لائیں گے۔[105] ۴۶

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں جاتے تو اپنی سعادت مندی اور وفاداری کی نمایش کے لیے 'سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا' تو بات بات پر کہتے، لیکن لب ولہجہ کے تصرف سے اس کو ادا اس طرح کرتے کہ 'اَطَعْنَا' کو 'عَصَيْنَا' بنا لیتے۔ چونکہ دونوں کے حروف ہم آہنگ اور قریب المخرج ہیں، اس وجہ سے اس تحریف میں ان کو کامیابی ہو جاتی۔ اس طرح وہ تسلیم واطاعت کے جملہ کو نافرمانی وسرکشی کے قالب میں ڈھال دیتے اور سمجھنے والے ان کی اس شرارت پر کوئی گرفت بھی نہ کر سکتے، اس لیے کہ وہ بڑی آسانی سے یہ بہانہ بنا سکتے تھے کہ ہم نے 'سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا' کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شریف اور خوددار آدمی بات کو سن اور سمجھ کر بھی خاموشی سے ٹال دینے ہی کو بہتر خیال کرتا ہے۔

'اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ' کے لفظی معنی ہیں: سنو وہ بات جو پہلے سنائی نہیں گئی۔ اس فقرے کا اچھا محل یہ ہے کہ مجلس میں متکلم یا خطیب کی کوئی حکیمانہ بات سن کر ایک سامع دوسرے سامع کو متوجہ کرے کہ یہ دانش مندانہ اور حکیمانہ بات سنیے، یہ بات پہلی بار ہمارے کانوں نے سنی ہے، اس سے پہلے یہ بات کبھی ہم نے نہیں سنی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نہ صرف متکلم اور خطیب کی قدر دانی کی دلیل ہے، بلکہ دوسروں کو اس کی قدر دانی کے لیے تشویق وترغیب بھی ہے، لیکن کوئی شخص ہوٹنگ (hooting) کے انداز میں بانداز تمسخر یہی بات کہے تو اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ 'ذرا اس کی ناشنیدنی سنو، یہ کیسی بے پر کی اڑا رہا ہے، ایسی بات کا ہے کو کبھی کسی نے سنی ہو گی!' ظاہر ہے کہ محض انداز اور لب ولہجہ کی تبدیلی نے اس نہایت اعلیٰ فقرے کو طعن وطنز کا ایک زہر آلود نشتر بنا دیا۔ لیکن اس پر بھی کوئی گرفت نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ گرفت ہو تو کہنے والا صفائی پیش کر سکتا ہے کہ میں نے تو طنز کے طور پر نہیں، بلکہ تحسین کے طور پر کہا ہے۔ چونکہ اس فقرے میں طنز کا پہلو 'غَيْرَ مُسْمَعٍ' کے الفاظ سے پیدا ہوتا تھا، اس لیے قرآن نے اس کی یہ نوک توڑ دی اور ہدایت کی کہ صرف 'اِسْمَعْ' کہا جائے۔

'رَاعِنَا' کے لفظی معنی ہیں، ذرا ہماری رعایت فرمایے۔ اس لفظ کا اچھا محل استعمال یہ ہے کہ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو یا بات ایسی لطیف اور حکیمانہ ہو کہ خود متکلم کی زبان سے اس کو مکرر سننا چاہے تو اس کو دوبارہ متوجہ کرنے کے لیے جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں: پھر ارشاد ہو، پھر فرمایے، اسی طرح عربی میں 'رَاعِنَا' کہتے ہیں۔ یہ لفظ سامع کے ذوق وشوق اور اس کی رغبت علم کی دلیل ہے، لیکن یہودی اشرار 'لیّ لسان' یعنی زبان کے توڑ مروڑ کے ذریعے سے اس کو بھی طنز کے قالب میں ڈھال لیتے تھے۔ اس کی شکل یہ ہوتی کہ 'رَاعِنَا' میں 'ع' کے کسرہ کو ذرا دبا دیجیے تو یہ لفظ 'رَاعِيْنَا' بن جائے گا اور اس کے معنی ہوں گے: ''ہمارا چرواہا''۔ قرآن نے یہود کی

www.javedahmadghamidi.com

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ، اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْھًا فَنَرُدَّھَا عَلآی اَدْبَارِھَآ، اَوْ نَلْعَنَھُمْ کَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ، وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

اے وہ لوگو، جنھیں کتاب دی گئی، اُس چیز کو مان لو[۱۰۶] جو ہم نے اُن چیزوں کی تصدیق میں اتاری ہے جو خود تمھارے پاس موجود ہیں۔ (مان لو)، اِس سے پہلے کہ ہم چہرے بگاڑ دیں[۱۰۷] اور اُن کو پیچھے کی طرف الٹ کر برابر کر دیں[۱۰۸] یا اُن پر بھی (جن کے یہ چہرے ہیں) اُسی طرح لعنت کر دیں، جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کر دی تھی[۱۰۹] اور (یاد رکھو کہ) خدا کی بات ہو کر رہتی ہے۔ ۴۷

اس شرارت کی وجہ سے اس لفظ کو سرے سے مسلمانوں کے مجلسی الفاظ ہی سے خارج کر دیا اور اس کی جگہ 'اُنْظُرْنَا' کے استعمال کی ہدایت فرمائی جس کے معنی ہیں: ذرا ہمیں مہلت عنایت ہو، ذرا پھر توجہ فرمایے۔ یعنی مفہوم کے لحاظ سے یہ ٹھیک ٹھیک 'رَاعِنَا' کا قائم مقام ہے اور اس میں لہجہ کے بگاڑ سے کسی بگاڑ کے پیدا کیے جانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۰۹)

[۱۰۵] یعنی ان میں سے شاذ کوئی مان لے تو مان لے، ایک گروہ کی حیثیت سے اب ان کے ایمان لانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لیے کہ اتمام حجت کے باوجود جب انھوں نے رسول کی تکذیب کا فیصلہ کر لیا ہے تو ان کے اس جرم کی پاداش میں اللہ نے بھی ان پر لعنت کر دی ہے جس کے نتیجے میں یہ توفیق ہدایت سے محروم ہو چکے ہیں۔

[۱۰۶] یہ تہدید و وعید کی آیت ہے۔ اس میں دعوت کا ذکر محض اتمام حجت کے لیے ہوا ہے۔

[۱۰۷] اصل میں 'ان نطمس وجوھًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'طمس الشیٔ' کے معنی کسی چیز کے آثار و علامات مٹا دینے کے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ تمھارے چہروں پر یہ آنکھ، کان، منہ اور ناک کے نشانات مٹا کر برابر کر دیں گے، اس لیے کہ یہ قوتیں جس مقصد سے عطا ہوئی ہیں، جب ان سے وہ کام نہیں لیا گیا تو انھیں باقی رکھنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کے بعد تو یہی بہتر ہے کہ چہرے بھی اسی طرح سپاٹ بنا دیے جائیں، جس طرح سر کے پیچھے کا حصہ سپاٹ ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ 'وجوھًا' کا لفظ اس جملے میں نکرہ آیا ہے۔ یہ نفرت و کراہت کے اظہار کے لیے ہے اور اس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ متکلم ان لعنت زدہ چہروں کا تعین کے ساتھ ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ، وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ، وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰٓی اِثْمًا عَظِیْمًا﴿۴۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ،

(اِن کا خیال ہے کہ اِن کے عقائد واعمال خواہ کچھ ہوں، یہ لازماً جنت میں جائیں گے۔ اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ اِس بات کو نہیں بخشے گا کہ (جانتے بوجھتے کسی کو) اُس کا شریک ٹھیرایا جائے۔[۱۱۰] اِس کے نیچے، البتہ جس کے لیے جو گناہ چاہے گا، (اپنے قانون کے مطابق) بخش دے گا[۱۱۱]، اور

'وجوھھم' نہیں کہا، ان سے منہ پھیر کر 'وجوھًا' کہا ہے۔ اس کے بعد 'نلعنھم' کی ضمیر غائب بھی اسی رعایت سے آئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ چہروں کو بگاڑ دینے کی دھمکی جو ان کو دی گئی، اس میں عمل اور سزا کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اوپر والی آیت میں ان کی یہ حرکت جو بیان ہوئی ہے کہ پیغمبر کا مذاق اڑانے کے لیے منہ بنا بنا کر اور لہجے بگاڑ بگاڑ کر الفاظ کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں اور اس منہ بنانے اور الفاظ کے بگاڑنے کو انھوں نے ہنر سمجھ رکھا ہے، اس کی بنا پر وہ مستحق ہوئے کہ واقعی ان کے چہرے مسخ ہی کر دیے جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس جنھوں نے حق سے منہ موڑنے ہی کو شیوہ بنا لیا ہے تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے چہرے پیچھے ہی کی طرف الٹ دیے جائیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۱۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

[۱۰۸] اس سے پہلے جو مضمون 'ان نطمس وجوھًا' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے، یہ اسی کی تفصیل ہے۔

[۱۰۹] یعنی یہود کے جن لوگوں نے سبت کے دن کی بے حرمتی کی، ان پر لعنت کر دی تھی۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ یہ ذلیل بندر بنا دیے گئے۔ قرآن میں یہ واقعہ جس طرح بیان ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان کی سیرت مسخ ہوئی اور اس کے بعد ایک ظاہری فرق جو تھوڑا سا رہ گیا تھا، وہ بھی بالآخر مٹ گیا۔ یہاں تک کہ اس لعنت نے ان کے ظاہر و باطن، ہر چیز کا احاطہ کر لیا۔

[۱۱۰] اس لیے کہ شرک خدا پر افترا ہے اور اس لحاظ سے سب سے بڑا ظلم ہے جس کا ارتکاب کوئی شخص خدا کی زمین پر کر سکتا ہے۔ اس سے توبہ اور رجوع کے بغیر کوئی شخص اگر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو خدا کی بارگاہ میں پھر اس کے لیے معافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

[۱۱۱] اس سے واضح ہے کہ دوسرے گناہوں کے معاملے میں بھی کسی کو دلیر نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ یہ بھی اسی

بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ، وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ، وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ، وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا: هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓئِكَ

(اِس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ) جو اللہ کو شریک ٹھیراتا ہے، وہ ایک بہت بڑے گناہ کا افترا کرتا ہے۔

تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو (شرک جیسے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں اور اِس کے باوجود) اپنے آپ کو پاکیزہ ٹھیراتے ہیں[112]۔ (ہرگز نہیں)، بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے (اپنے قانون کے مطابق) پاکیزگی عطا کرتا ہے[113]۔ (یہ اپنے کرتوتوں کی سزا لازماً بھگتیں گے) اور اِن پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اِنھیں دیکھو، (اپنے اِن دعووں سے) یہ کیسا افترا باندھ رہے ہیں اور (حقیقت یہ ہے کہ) صریح گناہ ہونے کے لیے تو یہی کافی ہے۔ ۴۸-۵۰

تم نے دیکھا نہیں اِن لوگوں کو جو خدا کی کتاب سے بہرہ یاب ہوئے۔ یہ جبت اور طاغوت[114] پر عقیدہ رکھتے ہیں اور منکروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو یہ ہیں[115]۔ یہ لوگ

وقت معاف ہوں گے، جب خدا چاہے گا اور خدا کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے اپنی حکمت اور اپنے قانون کے مطابق چاہتا ہے۔ اس کی کوئی مشیت بھی الل ٹپ نہیں ہوتی۔ وہ علیم و حکیم ہے اور اس کی یہ صفات اس کی ہر مشیت کے ساتھ شامل رہتی ہیں۔

[۱۱۲] یعنی اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ ہم چونکہ خدا کے محبوبوں کی اولاد اور اس کی برگزیدہ امت ہیں، اس لیے بڑے بڑے گناہوں کا مرتکب ہونے کے باوجود اس کی جنت میں داخل ہونے کے لیے جو پاکیزگی چاہیے، وہ ہمیں ہر حال میں حاصل رہتی ہے۔

[۱۱۳] یعنی اپنے اس قانون کے مطابق کہ پاکیزگی ایمان و عمل اور بر و تقویٰ سے وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نعمت انھی کو عطا فرماتا ہے جو ان چیزوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کے بغیر یہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

[۱۱۴] یہود جن معاملات میں شرک کے مرتکب ہوئے، یہ اس کی ایک مثال ہے۔ اس میں جبت سے مراد

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ، وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ، فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ، فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے، پھر تم اُن کا کوئی مدد گار نہیں پا سکتے۔ کیا خدا کی بادشاہی میں اِن کا بھی کوئی حصہ ہے؟[116] اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگوں کو پھوٹی کوڑی بھی دینے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ کیا یہ لوگوں سے اللہ کی اُس عنایت پر حسد کر رہے ہیں جو اُس نے اُن پر کی ہے؟[117] (یہی بات ہے تو سن لیں کہ) ہم نے تو اولاد ابراہیم (کی اِس شاخ) کو اپنی حکمت اور اپنی شریعت بخش دی اور اُنھیں ایک عظیم بادشاہی عطا فرما دی ہے۔[118] ۵۱-۵۴

اعمال سفلیہ ہیں۔ ان میں چونکہ شیطانی قوتوں کو موثر بالذات مانا جاتا ہے، اس لیے جبت کے ساتھ طاغوت کا ذکر بھی ہوا ہے۔ اس میں اور شیطان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن میں یہ دونوں بالکل ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔

[۱۱۵] یعنی اس قدر پستی میں گر چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں کھلم کھلا مشرکین عرب کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے وہ کتاب الٰہی کی ان اصلاحات کو آڑ بناتے تھے جو ان بدعتوں اور تشددات کے خلاف تھیں جو ان کے فقہا نے خدا کی شریعت میں پیدا کر دیے تھے۔

[۱۱۶] یہ استفہام انکار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی بادشاہی اور اس کا اختیار و اقتدار اسی کے پاس ہے۔ اس نے اس کا کوئی حصہ انھیں نہیں دے رکھا ہے کہ یہ جس کو چاہیں دیں اور جسے چاہیں محروم کر دیں۔

[۱۱۷] یہ ان کے باطن سے پردہ اٹھا دیا ہے کہ ان کا تمام غم و غصہ صرف اس بات پر ہے کہ نبوت تو ان کے خاندان کا حصہ تھی۔ یہ اس سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے اندر کس طرح چلی گئی ہے؟

[۱۱۸] یعنی ان کے حسد کے علی الرغم بنی اسمٰعیل کے حق میں نبوت اور نبوت کے ساتھ ایک عظیم بادشاہی کا بھی فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ وہی بادشاہی ہے جو بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو حاصل ہوئی۔ اس وقت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ بِهٖ، وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ صَدَّ عَنۡهُ، وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيۡرًا ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ
كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِيۡهِمۡ نَارًا، كُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُهُمۡ بَدَّلۡنٰهُمۡ
جُلُوۡدًا غَيۡرَهَا لِيَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ،
خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَآ اَبَدًا، لَهُمۡ فِيۡهَآ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ، وَّنُدۡخِلُهُمۡ ظِلًّا ظَلِيۡلًا ﴿۵۷﴾

(یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک اُنھوں نے اس کی قدر نہیں پہچانی)۔ سو اُن میں ایسے بھی ہیں جو اِس (حکمت اور اس شریعت) پر ایمان لائے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو اِس سے منہ موڑ گئے ہیں۔ اِس طرح کے لوگوں کے لیے دوزخ کی بھڑکتی آگ ہی کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، اُنھیں ہم عنقریب ایک بڑی آگ میں جھونک دیں گے۔ اِن کی کھالیں جب پک جائیں گی، ہم اُن کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ بے شک، اللہ عزیز و حکیم ہے[119]۔ اور جو لوگ (ہماری آیتوں پر) ایمان لائے اور نیک عمل کیے، اُن کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُس میں اُن کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اُنھیں ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔ ۵۵-۵۷

یہ ایک پیشین گوئی تھی، لیکن چند ہی برسوں میں حقیقت بن گئی اور خدا کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں پوری شان کے ساتھ نافذ ہو گیا۔

[۱۱۹] لہٰذا نہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے اور نہ اس کا کوئی کام انصاف اور حکمت سے خالی ہو سکتا ہے۔ اس کا قانون بے لاگ ہے، بنی اسرائیل ہوں یا بنی اسمٰعیل، وہ ہر ایک کے ساتھ اسی کے مطابق معاملہ کرے گا۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طالب محسن

تغییر بالید

(مسلم، رقم ۴۹-۵۰)

عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ قَالَ: أَوَّلُ مَنْ بَدَأَ بِالْخُطْبَةِ يَوْمَ الْعِيدِ قَبْلَ الصَّلٰوةِ مَرْوَانُ. فَقَامَ اِلَيْهِ رَجُلٌ، فَقَالَ: الصَّلٰوةُ قَبْلَ الْخُطْبَةِ. فَقَالَ: قَدْ تُرِكَ مَا هُنَالِكَ. فَقَالَ اَبُو سَعِيْدٍ: أَمَّا هٰذَا فَقَدْ قَضٰى مَا عَلَيْهِ. سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ رَأٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ. فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ. فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ. وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ.

طارق بن شہاب بیان کرتے ہیں کہ جس شخص نے سب سے پہلے عید کے دن نماز سے پہلے خطبے کا آغاز کیا وہ مروان تھا۔ چنانچہ ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا: خطبے سے پہلے نماز ہے۔ اس نے کہا: اس موقع کا طریقہ چھوڑ دیا گیا۔ اس پر ابوسعید رضی اللہ عنہ نے کہا: اس شخص نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: تم میں سے جو کسی برائی کو دیکھے تو وہ اسے ہاتھ سے ہٹا دے۔ اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے ہٹا دے۔ اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے ہٹا دے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِي اُمَّةٍ قَبْلِي اِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ اُمَّتِهِ حَوَارِيُّونَ وَاَصْحَابٌ. يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهِ. ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوفٌ. يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ. وَيَفْعَلُونَ مَا لَا يُؤْمَرُونَ. فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ. وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ. وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ. وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی نبی ایسا نہیں ہے جسے مجھ سے پہلے کسی امت میں مبعوث کیا گیا ہو اور اس کی امت میں سے اس کے حواری اور اصحاب نہ ہوں۔ جو اس کی سنت پر عمل کرتے ہوں اور اس کے احکام کی پیروی کرتے ہوں۔ پھر اس کے بعد ان کے ناخلف سامنے آتے ہیں۔ یہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں اور وہ کرتے ہیں جس کا حکم نہیں دیا گیا۔ چنانچہ جس نے اپنے ہاتھ سے ان کے ساتھ جہاد کیا، وہ مومن ہے۔ جس نے زبان کے ساتھ ان سے جہاد کیا، وہ مومن ہے۔ جس نے دل کے ساتھ ان سے جہاد کیا، وہ مومن ہے اور اس کے نیچے رائی کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لغوی مباحث

منکر: بری چیز، برا عمل۔ یہ معروف کا متضاد ہے۔ معروف وہ ہے جسے معاشرے میں اچھا سمجھا جاتا ہے اور منکر وہ ہے جسے معاشرے میں برا سمجھا جاتا ہے۔ بعض شارحین نے اس لفظ کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ منکر وہ ہے جسے اللہ کے دین میں غلط قرار دیا گیا ہو۔ اگرچہ وہ چیزیں بھی منکر ہیں جنھیں اللہ کے دین میں غلط قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس لفظ کا مکمل اطلاق نہیں ہے۔ قرآن وحدیث میں معروف ومنکر کے الفاظ عربوں کے مسلمہ معروف ومنکر کی مناسبت سے بولے جاتے ہیں۔

فلیغیرہ: 'غَیّر' کا مطلب ہے تبدیل کرنا۔ مراد یہ ہے کہ منکر ختم کر کے اس کی جگہ معروف کو رائج کر دیا جائے۔ اس روایت میں یہ لفظ 'بیدہ'، 'بلسانہ' اور 'بقلبہ' کے ساتھ آیا ہے۔ ان میں سے ہر لفظ کی مناسبت سے اس کے معنی تبدیل ہو جائیں گے۔ 'بیدہ' کے ساتھ اس کا اطلاق عملی جدوجہد پر ہو گا۔ 'بلسانہ' کے ساتھ اس کا اطلاق وعظ و نصیحت پر ہو گا۔ اور 'بقلبہ' کے ساتھ اس کا اطلاق محض دل میں برا جاننے پر ہو گا۔

حواری: حواری کے لفظ کے معنی کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ صاحب مفردات القرآن امام راغب لکھتے ہیں: ''حورت الشیئ' کسی چیز کو گھمانا، سفید کرنا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے انصار و اصحاب کو حواریین کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ قصار یعنی دھوبی تھے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ صیاد یعنی شکاری تھے۔ بعض علما نے کہا کہ انھیں حواری اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو علمی اور دینی فائدہ پہنچا کر گناہوں کی میل سے اپنے آپ کو پاک کرتے تھے۔ یہ وہی پاکیزگی ہے جس کا ذکر 'اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡھِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَھۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَھِّرَکُمۡ تَطۡھِیۡرًا' (احزاب ۳۳:۳۳) کی آیت میں ہوا ہے۔ اس بنا پر انھیں تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قصار کہہ دیا گیا۔ اصل میں وہ دھوبی نہیں تھے۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو معرفت حقائق کی بنا پر کوئی پیشہ اختیار نہ کرے۔ اسی طرح انھیں شکاری کہا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو حق کی طرف لا کر گویا ان کا شکار کرتے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: زبیر میرے پھوپھی زاد اور میرے حواری ہیں۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے کہا: ہر نبی کا حواری ہے اور میرا حواری زبیر ہے۔ اس روایت میں حضرت زبیر کو حواری کہنا محض نصرت اور مدد کے پہلو سے ہے[۱]۔'' مولانا امین احسن اصلاحی نے ''تدبر قرآن'' میں حواری کے حوالے سے لکھا:

> ''حواری' کا لفظ عربی میں عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے لغوی مفہوم میں اہل لغت کا اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے معنی خیر خواہ، حامی، ناصر اور مددگار کے ہیں۔ جس طرح انصار کا لفظ مدینہ کے ان جان نثاروں کے لیے خاص ہوا جنھوں نے ابتداے دعوت ہی سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا، اسی طرح 'حواریین' کا لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان خاص شاگردوں کے لیے استعمال ہوا جو آپ پر ایمان لائے، ہر قسم کے نرم و گرم حالات میں آپ کے ساتھ رہے، آپ نے پوری شفقت اور دل سوزی سے شب و روز جن کی تعلیم و تربیت کی اور جو بالآخر آپ کے داعی، نقیب اور آپ کے پیغام بر بن کر بنی اسرائیل کی ایک ایک بستی میں پہنچے[۲]۔''

---

[۱] دیکھیے مادہ ح و ر۔

[۲] تدبر قرآن ۲/ ۹۸۔

اس روایت میں یہ لفظ جس محل پر استعمال ہوا ہے اس سے بالکل واضح ہے کہ اس لفظ کے معنی بالکل وہی ہیں جو مولانا اصلاحی نے بیان کیے ہیں۔ اصحاب پر اس لفظ کا عطف اس کے اسی پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔

خلوف: یہ 'خَلْف' کی جمع ہے۔ اس کا مطلب ہے برے جانشین۔ لام کی فتح کے ساتھ یہ لفظ اچھے جانشینوں کے لیے آتا ہے اور اس کی جمع 'اخلاف' آتی ہے۔

معنی

دونوں روایتوں کے دو حصے ہیں۔ پہلی روایت کا پہلا حصہ مروان کے عید کے خطبے کے وقت کو بدلنے کے بیان پر مشتمل ہے۔ دوسری روایت کا پہلا حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بیان پر مشتمل ہے کہ نبی کے ساتھی کس کردار کے ہوتے ہیں اور بعد میں کیا تبدیلی آتی ہے۔

مروان کے خطبہ پہلے دینے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ لوگ خطبہ سنے بغیر چلے جاتے تھے۔ چنانچہ اس کا حل یہ نکالا کہ جمعے کی طرح نماز کو موخر کر دیا جائے تاکہ لوگ خطبہ سنے بغیر نہ جا سکیں۔ لیکن اسے ٹوک دیا گیا اور یہ واضح کر دیا گیا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے خلاف ہے۔ اس روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ پہلا شخص جس نے اس طرح کی تبدیلی کی وہ مروان تھا۔ ابتدا کی نسبت حضرت عثمان، حضرت معاویہ اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے بھی کی گئی ہے۔ لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ لہٰذا عمومی رائے یہی ہے کہ یہ کام مروان ہی نے کیا تھا۔ لیکن یہ انحراف چل نہیں سکا اور امت میں وہی طریقہ رائج رہا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا۔

دوسری روایت کے ابتدائی حصے میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ ہر نبی کے کچھ ساتھی اور کچھ مددگار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نبی کی تعلیمات اور اس کے اوامر و نواہی کے پابند ہوتے ہیں۔ اس کے اسوہ کی پیروی کرتے ہیں، لیکن اس کے بعد یہ صورت باقی نہیں رہتی اور ان کے جانشینوں میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک طرف وہ قول و فعل کے تضاد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف ایسی باتیں دین کے نام پر پیش کرنے لگ جاتے ہیں جن کا دین میں حکم نہیں ہوتا۔ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہو چکی ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ اس طرح کے حالات میں اہل خیر کو کیا کرنا چاہیے۔ اگلا حصہ لفظی فرق کے باوجود وہی ہے جو پہلی روایت میں بھی آ چکا ہے۔

اس حصے میں وضاحت طلب نکات چار ہیں:

ایک یہ کہ منکر کسے کہتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

دوسرے یہ کہ تغییر بالید یا جہاد بالید سے کیا مراد ہے۔

تیسرے یہ کہ اضعف الایمان کی وعید کس کے لیے ہے۔

چوتھے یہ کہ اس میں بیان کردہ ذمہ داری کا مکلّف کون ہے۔

شارحین نے بالعموم اس کی وضاحت میں یہ لکھا ہے کہ اس سے وہ چیزیں مراد ہیں جنھیں شارع نے غلط قرار دیا ہے۔ہم نے لغوی مباحث میں بیان کر دیا ہے کہ ہمارے نزدیک یہ معروف کے مقابل میں آتا ہے۔انسانوں کے بیچ مسلمہ خیر کے لیے عرب معروف کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور مسلمہ شر کے لیے منکر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ہاں، یہ بات درست ہے کہ شریعت کے بیان کردہ منکرات بھی اس میں شامل ہیں۔

تغییر بالید، تغیر باللسان اور تغییر بالقلب، تینوں کی وضاحت کرتے ہوئے شارحین نے لکھا ہے کہ تغییر بالید سے مراد برائی کو عملاً ہٹا دینا ہے۔ جیسے آلات موسیقی کو توڑ دینا، غصب کو چھڑوانا، شراب بہا دینا وغیرہ۔ اگر اس عمل سے زیادہ فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو یا برائی کرنے والا زیادہ قوی ہو تو زبان سے منع کرے۔ یہ تغییر باللسان ہے۔اسی طرح شارحین کے نزدیک دل میں برا جاننے کے لیے اس روایت میں تغییر بالقلب کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

سب سے زیادہ کمزور ایمان کا مظہر یہ تیسرا طریقہ ہے۔ یہ وعید اس شخص کے لیے ہے جو برائی کرنے والے کو زبان سے روکنے کا حوصلہ بھی نہیں کر پاتا۔

بعض شارحین نے اس روایت کو ایک دوسرے زاویے سے سمجھا ہے۔ان کا خیال یہ ہے کہ تغییر باللسان کی ذمہ داری علما کی ہے اور تغییر بالید کے ذمہ دار امرا و حکام ہیں۔

یہ دونوں حل اضعف کے لفظ سے پیدا ہونے والے مفہوم اور 'اگر استطاعت نہ ہو' کی شرط کی تکرار کو نظر انداز کیے بغیر طے نہیں کیے جا سکتے۔ دوسرا حل استطاعت کے متفرق مفہوم پر مبنی ہے۔ اگر استطاعت کا مختلف مفہوم نہ لیا جائے تو ایک کو امرا اور دوسرے کو علما سے متعلق کرنا ممکن نہیں۔ اس طرح کے تقابل کے جملے میں ایک ہی لفظ کے دو مختلف معنی لینا زبان کے عام قواعد کے منافی ہے۔ پھر یہ بات بھی غیر واضح ہو جاتی ہے کہ اضعف الایمان سے کیا مراد ہے۔ مثلاً اگر وہ حاکم نہیں ہے اور زبان سے نصیحت کرتا ہے تو اسے 'ان لم یستطع' کے لفظ سے بیان کیوں کیا گیا ہے۔

یہی صورت پہلے حل کی ہے۔ اس میں بھی استطاعت سے جسمانی طاقت یا خارجی امکانات ہی کو مراد لیا گیا ہے۔ اس پر بھی یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی آدمی طاقت ہی نہیں رکھتا تو اسے اضعف الایمان کیوں قرار دیا جائے۔ سیوطی نے اس شرح پر یہی تبصرہ کیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں حل روایت کو پوری طرح حل نہیں کرتے۔ استاد محترم نے اس روایت کے صحیح مفہوم کو بہت خوبی سے واضح کیا ہے۔ ''قانون دعوت'' میں لکھتے ہیں:

''...'تواصوا بالحق' کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ اگر کوئی منکر دیکھیں تو اپنے دائرۂ اختیار میں اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کا ارشاد ہے:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ. (مسلم، رقم ۴۹)

''تم میں سے کوئی شخص (اپنے دائرۂ اختیار میں) کوئی برائی دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ ہاتھ سے اس کا ازالہ کرے۔ پھر اگر اس کی ہمت نہ ہو تو زبان سے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل میں اسے ناگوار سمجھے اور یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔''

'ان لم یستطع' کے الفاظ یہاں اس استطاعت کے لیے استعمال نہیں ہوئے جو آدمی کو کسی چیز کا مکلّف ٹھیراتی ہے، بلکہ ہمت اور حوصلے کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں جو ایمان کی قوت اور کمزوری سے کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کے دائرۂ اختیار میں اس کا پہلا کام یہی ہے کہ خود دین ہی کی کوئی مصلحت مانع نہ ہو تو قوت سے منکر کو مٹا دے۔ زبان سے روکنے کا درجہ اس دائرے میں دوسرا ہے اور دل کی نفرت وہ آخری درجہ ہے کہ آدمی اگر اس پر بھی قائم نہ رہا تو اس کے معنی پھر یہی ہیں کہ ایمان کا کوئی ذرہ بھی اس میں باقی نہیں رہ گیا ہے۔

قرآن کی تصریحات، دین کے مسلمات، رسولوں کی سیرت اور روایت کے اپنے الفاظ کی روشنی میں اس کی صحیح تاویل یہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔ شوہر، باپ، حکمران سب اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں لاریب، اسی کے مکلّف ہیں کہ منکر کو قوت سے مٹا دیں۔ اس سے کم جو صورت بھی وہ اختیار کریں گے، بے شک، ضعف ایمان کی علامت ہے۔ لیکن اس دائرے سے باہر اس طرح کا اقدام جہاد نہیں، بلکہ بدترین فساد ہے جس کے لیے دین میں ہرگز کوئی گنجایش ثابت نہیں کی جا سکتی۔ قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ داعی کی حیثیت سے خدا کے کسی پیغمبر کو بھی تذکیر اور بلاغ مبین سے آگے کسی اقدام کی اجازت نہیں دی گئی۔ ارشاد فرمایا ہے:

إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ، لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ. (الغاشیہ ۸۸: ۲۱-۲۲)

''تم نصیحت کرنے والے ہو، تم ان پر کوئی داروغہ نہیں ہو۔''

(قانون دعوت ۴۲)

ہمارے اس زمانے میں بعض لوگ برائی کو قوت سے ختم کرنے کی اپنی پالیسی کے حق میں اس روایت کو پیش

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

کرتے ہیں۔قوت سے ان کی مراد جماعت اور جتھے کی قوت ہے۔استاد محترم نے واضح کر دیا ہے کہ اس روایت سے یہ معنی لینا درست نہیں ہے۔ یہ روایت فرد کے داخلی ضعف پر اسے متنبہ کرتی ہے۔اسے یاد دلاتی ہے کہ اپنے دائرۂ کار اور اپنی حیثیت کے مطابق ہر فرد کو منکر کے خلاف کارروائی کرنی چاہیے۔اگر وہ منکر کے معاملے میں اپنی حیثیت کے مطابق متحرک نہیں ہوتا تو اس کی وجہ اس کے ایمان کی کمزوری کو نہیں ہونا چاہیے۔

بعض شارحین نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ ازالۂ منکر کا یہ کام متفقہ امور ہی میں ہونا چاہیے۔ وہ امور جہاں آرا کا اختلاف ہو، یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات اس وجہ سے کہنا پڑی ہے کہ منکر کا اطلاق شرعی منکر پر کیا گیا ہے۔ہم نے منکر کے معنی جس طرح واضح کیے ہیں،اس کے بعد یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

متون

پہلی روایت میں حضرت ابوسعید خدری کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو بیان کرنے کا موقع بھی نقل ہوا ہے۔ کچھ محدثین نے مروان سے متعلق اس واقعے سے مجرد بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔مسلم کی محولہ بالا روایت میں مروان کے صرف خطبہ پہلے دینے کے انحراف کو بیان کیا گیا ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مروان کے لیے منبر بھی باہر نکالا گیا تھا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کے زمانے میں یہ کام بھی نہیں کیا گیا تھا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوسعید نے ایک آدمی کے ٹوکنے کے بعد بات کی تھی،لیکن کچھ روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوسعید نے براہ راست بھی بات کی تھی۔شارحین نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعات ہیں۔ بظاہر تطبیق کی یہ صورت درست نہیں لگتی۔ واقعے کو نقل کرنے میں اس طرح کی کمی بیشی روایات میں عام ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ حضرت ابوسعید پر کسی دوسرے آدمی کا سبقت لے جانا موزوں نہیں ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ واقعات کی تفصیل معلوم کیے بغیر اس طرح کا کوئی تبصرہ بے محل ہے۔

روایت کے دوسرے حصے میں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے جو روایت کے کسی معنوی پہلو کو واضح کرنے میں معاون ہو۔ کچھ لفظی فرق کے ساتھ ہر متن میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔روایت کے اہم الفاظ مثلاً تغییر، ید،لسان،قلب اور اضعف سب روایات میں یہی الفاظ دہرائے گئے ہیں۔

امام مسلم اسی مضمون کی حامل دوسری روایت بھی لائے ہیں۔اس روایت میں تغییر کے بجائے 'جاھد' کا لفظ آیا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہے۔ یہ فرق اہم ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تغییر بالید سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ڈنڈا سوٹا اٹھانا نہیں ہے، بلکہ آپ کی مراد عملی جدوجہد ہے۔

کتابیات

مسلم، رقم ۴۹، ۵۰۔ ابوداؤد، رقم ۱۱۴۰، ۴۳۴۰۔ نسائی، رقم ۵۰۰۸۔ ترمذی، رقم ۲۱۷۲۔ ابن ماجہ، رقم ۱۲۷۲، ۴۰۱۳۔ احمد، رقم ۳۴۷۹، ۴۴۰۲، ۱۱۰۸۸، ۱۱۱۶۶، ۱۱۴۷۸، ۱۱۵۳۲، ۱۱۸۹۴۔ ابن حبان، رقم ۳۰۶، ۳۰۷، ۶۱۹۳۔ بیہقی، رقم ۵۹۹۷، ۶۱۹۳، ۱۱۲۹۳، ۱۴۳۲۵، ۱۹۹۶۶۔ ابویعلیٰ، رقم ۱۰۰۹۔ سنن کبریٰ، رقم ۱۱۷۳۹۔ معجم کبیر، رقم ۹۷۸۴۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معز امجد

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنا

روایت کا مضمون

ابوداؤد، رقم ۲۷۹۰ کے مطابق بیان کیا جاتا ہے کہ:

قال حنش: رأيت عليا يضحي بكبشين. فقلت له: ما هذا؟ فقال: إن رسول اللّٰه أوصاني أن أضحي عنه، فأنا أضحي عنه.

حنش نے کہا: میں نے علی رضی اللہ عنہ کو دو مینڈھے ذبح کرتے ہوئے دیکھا تو ان سے پوچھا: یہ کیا (آپ دو جانور کیوں ذبح کر رہے ہیں)؟ علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں ان کی طرف سے بھی قربانی کیا کروں چنانچہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرتا ہوں۔

روایت پر تبصرہ

یہ روایت بعض اختلافات کے ساتھ درج ذیل مقامات پر بھی نقل ہوئی ہے:

ترمذی، رقم ۱۴۹۵؛ احمد بن حنبل، رقم ۸۴۳، ۱۲۷۵، ۱۲۷۸؛ بیہقی، رقم ۱۸۹۷۰؛ ابویعلیٰ، رقم ۴۵۹۔

یہ تمام روایتیں حنش بن معتمر کے ذریعے سے نقل ہوئی ہیں۔ اس کے بارے میں اہل علم کی مثبت و منفی، دونوں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طرح کی آرا پائی جاتی ہیں[1]۔ علامہ البانی نے بھی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے[2]۔

نتیجۂ بحث

اس روایت کی سند چونکہ ضعیف ہے، اس لیے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت کے معاملے میں توقف کیا جائے۔

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ وترتیب: اظہار احمد

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: الضعفاء الکبیر ۱/ ۲۸۸، الجرح والتعدیل ۱/ ۲۶۹، المجروحین ۱/ ۲۶۹، ضعفاء البخاری ۱/ ۳۸، تہذیب الکمال ۷/ ۴۳۲، الکامل فی الضعفاء ۲/ ۴۳۸۔

[2] ضعیف سنن ابی داؤد، رقم ۲۷۰۹؛ ضعیف سنن الترمذی، رقم ۱۴۹۵۔

محمد رفیع مفتی

قسم توڑنے کا حکم

روی أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال[1]: من حلف علی یمین فرأی غیرھا خیرا منھا فلیدع یمینہ ولیأت[2] الذی ھو خیر و لیکفر عن یمینہ.

روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی بات پر قسم کھائے اور پھر کسی دوسری بات کو اس سے بہتر پائے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی قسم کو چھوڑ کر اس کا کفارہ دے اور اس بہتر بات ہی کو اختیار کرے[1]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ قسم اپنے عہد پر اللہ کو گواہ ٹھہرانا ہے۔ آدمی جب کوئی قسم کھائے تو اسے چاہیے کہ وہ لازماً اسے پورا کرے۔ لیکن اگر کبھی اس کے سامنے یہ بات آ جائے کہ قسم کو پورا کرنے کی صورت میں وہ اس سے بہتر کسی کام سے یا خیر و تقویٰ کی کسی بات سے محروم رہ جاتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ قسم کو پورا کرنے کے بجائے اس کا کفارہ دے اور اس بہتر کام یا خیر و تقویٰ کے حوالے سے اس بہتر بات ہی کو اختیار کرے۔

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ مسلم کی روایت، رقم ۱۶۵۰ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ مضمون یا اس کے بعض حصے حسب ذیل (۵۰) مقامات پر نقل ہوئے ہیں:

موطا، رقم ۱۰۱۷۔ مسلم، رقم ۱۶۵۰ (۲)، ۱۶۵۱ (۳)۔ ترمذی، رقم ۱۵۳۰۔ نسائی، رقم ۳۷۸۱، ۳۷۸۲، ۳۷۸۵، ۳۷۸۶، ۳۷۸۷۔ ابن ماجہ، رقم ۲۱۰۸، ۲۱۱۱۔ احمد بن حنبل، رقم ۶۹۹۰، ۶۷۳۶، ۶۹۰۷، ۶۹۶۹، ۸۷۱۹، ۱۱۷۴۵، ۱۸۲۷۰، ۱۸۲۷۷، ۱۸۲۸۳، ۱۸۲۹۹، ۱۸۲۹۱، ۱۹۳۹۹۔ ابن حبان، رقم ۴۳۴۵، ۴۳۴۶، ۴۳۴۷، ۴۳۴۹، ۴۳۵۲۔ بیہقی، رقم ۱۸۶۳۳، ۱۸۶۳۴، ۱۹۶۲۷، ۱۹۶۳۲، ۱۹۶۳۴، ۱۹۶۴۴، ۱۹۶۴۵، ۱۹۷۳۴، ۱۹۷۴۴، ۱۹۷۴۶، ۱۹۷۴۷، ۱۹۷۴۸، ۱۹۶۳۳، ۱۹۶۳۶۔ ابویعلیٰ، رقم ۵۷۶۲۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۳۰۱، ۱۲۳۰۳۔ دارمی، رقم ۲۳۴۵۔ ابوداؤد، رقم ۳۲۷۴۔

بعض روایات مثلاً موطا، رقم ۱۰۱۷ میں 'علی یمین' (قسم پر) کے بجائے 'بیمین' (قسم پر) کے الفاظ، 'ولیکفر' (اور چاہیے کہ وہ کفارہ دے) کے بجائے 'فلیکفر' (پھر چاہیے کہ وہ کفارہ دے) کے الفاظ اور 'ولیأت' (اور چاہیے کہ وہ اختیار کرے) کے بجائے 'ولیفعل' (پھر چاہیے کہ وہ بجالائے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۶۵۰ میں 'فلیدع یمینه ولیأت' (پھر چاہیے کہ وہ اپنی قسم کو چھوڑ دے اور اختیار کرے) کے بجائے 'فلیأت' (پھر چاہیے کہ وہ اختیار کرے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۶۵۰ ہی کی ایک دوسری سند میں 'ولیکفر عن یمینه' (اور چاہیے کہ وہ اپنی قسم کا کفارہ دے) کے بجائے 'فلیکفر یمینه' (پھر چاہیے کہ وہ اپنی قسم کا کفارہ دے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۷۸۱ میں 'فلیکفر عن یمینه' (پھر چاہیے کہ وہ اپنی قسم کا کفارہ دے) کے الفاظ پہلے آئے ہیں اور 'ولیأت الذی هو خیر' (اور چاہیے کہ وہ اسے اختیار کرے جو بہتر ہے) کے الفاظ بعد میں۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۷۸۲ میں 'من حلف' (جس نے قسم کھائی) کے بجائے 'اذا حلف أحدکم' (جب تم میں سے کوئی قسم کھائے) کے الفاظ اور 'ولیأت الذی هو خیر' (اس بات کو اختیار کرے جو بہتر ہے) کے بجائے 'ولینظر الذی هو خیر فلیأته' (اور چاہیے کہ وہ اس بات کو دیکھے جو بہتر ہے اور پھر اسے اختیار کرے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۷۸۶ میں 'ولیکفر عن یمینه' (اور چاہیے کہ وہ اپنی قسم کا کفارہ دے) کے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بجائے 'ولیکفرھا' (اور چاہیے کہ وہ اس کا کفارہ دے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۷۸۷ میں 'فرأى غيرها خيرا منها' (پھر کسی دوسری بات کو اس سے بہتر پائے) کے بجائے 'فرأى خيرا منها' (پھر اس سے بہتر پائے) کے الفاظ اور 'فليدع يمينه' (پھر چاہیے کہ وہ اپنی قسم کو چھوڑ دے) کے بجائے 'وليترك يمينه' (اور چاہیے کہ وہ اپنی قسم چھوڑ دے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن ماجہ، رقم ۲۱۱۱ میں 'فليدع يمينه' (پھر چاہیے کہ وہ اپنی قسم کو چھوڑ دے) کے بجائے 'فليتركها' (پھر چاہیے کہ وہ اسے چھوڑ دے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں، اسی روایت میں 'فإن تركها كفارتها' (کیونکہ اسے چھوڑ نا ہی اس کا کفارہ ہے) کے الفاظ بھی آئے ہیں، یہی الفاظ یا اس سے ملتے جلتے الفاظ بعض دوسری روایات میں بھی موجود ہیں، لیکن چونکہ ان الفاظ پر مشتمل کوئی روایت بھی سنداً مضبوط نہیں پائی گئی، لہٰذا ان الفاظ کو یہاں زیر بحث نہیں لایا گیا۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۸۲۷۰ میں 'وليأت الذي هو خير' (اور چاہیے کہ وہ اس بہتر بات ہی کو اختیار کرے) کے بجائے 'فليأت بالذي هو خير' (پھر چاہیے کہ وہ اس بہتر بات ہی کو اختیار کرے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن حبان، رقم ۴۳۴۵ میں 'فليدع يمينه' (پھر چاہیے کہ وہ اپنی قسم کو چھوڑ دے) کے بجائے 'ثم ليترك يمينه' (پھر چاہیے کہ وہ اپنی قسم چھوڑ دے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۳۴ میں 'فليدع يمينه' (پھر چاہیے کہ وہ اپنی قسم کو چھوڑ دے) کے بجائے 'وليترك' (اور چاہیے کہ وہ چھوڑ دے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۴۵ میں 'وليأت' (اور چاہیے کہ وہ اختیار کرے) کے بجائے 'فأتى' (تو وہ اختیار کرے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۷۳۴ میں 'وليأت الذي هو خير' (اور چاہیے کہ وہ اس بہتر بات ہی کو اختیار کرے) کے بجائے 'فليأتها' (پھر چاہیے کہ وہ اسے اختیار کرے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۷۴۶ میں 'وليأت الذي هو خير' (اور چاہیے کہ وہ اس بہتر بات ہی کو اختیار کرے) کے بجائے 'وليفعل' (اور چاہیے کہ وہ بجا لائے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۷۴۷ میں 'فرأى غيرها خيرا منها' (پھر کسی دوسری بات کو اس سے بہتر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پائے)کے بجائے 'ثم رأی خیرا مما حلف علیه' (پھر وہ دیکھے اس سے بہتر جس پر اس نے قسم کھائی ہے) کے الفاظ اور 'الذی هو خیر' (جو بہتر ہے) کے بجائے 'الذی هو خیر منه' (جو اس سے بہتر ہے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۷۴۸ میں 'ولیکفر عن یمینه' (اور چاہیے کہ وہ اپنی قسم کا کفارہ دے) کے بجائے 'فلیکفرها' (پھر چاہیے کہ وہ اس کا کفارہ دے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۳۰۱ میں 'ولیکفر عن یمینه' (اور چاہیے کہ وہ اپنی قسم کا کفارہ دے) کے بجائے 'ولیکفر یمینه' (اور چاہیے کہ وہ اپنی قسم کا کفارہ دے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۳۰۳ میں 'فرأی غیرها خیرا منها' (پھر کسی دوسری بات کو اس سے بہتر پائے) کے بجائے 'فرأی ما هو خیر منها' (پھر وہ دیکھے اسے جو اس سے بہتر ہے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۶۵۱ میں 'فرأی غیرها خیرا منها' (پھر کسی دوسری بات کو اس سے بہتر پائے) کے بجائے 'ثم رأی خیرا منها' (پھر وہ دیکھے اس سے بہتر کو) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

www.ghamidi.net

اسی مضمون کی روایت مسلم، رقم ۱۶۵۱ درج ذیل واقعے کے سیاق میں لائی گئی ہے۔

عن تمیم بن طرفة قال جاء سائل إلی عدی بن حاتم فسأله نفقة فی ثمن خادم أو فی بعض ثمن خادم فقال لیس عندی ما أعطیك إلا درعی ومغفری فأكتب إلی أهلی أن یعطوكها قال فلم یرض فغضب عدی فقال أما والله لا أعطیك شیئا ثم إن الرجل رضی فقال أما والله لولا أنی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من حلف علی یمین ثم

''تمیم بن طرفہ سے روایت ہے کہ عدی بن حاتم کے پاس ایک سائل آیا اور اس نے غلام کی قیمت یا اس کی قیمت کے کسی حصے کے بقدر رقم مانگی۔ اس نے کہا: میرے پاس اپنی زرہ اور خود کے علاوہ تجھے دینے کو کوئی چیز نہیں ہے تو (لاؤ) میں اپنے گھر والوں کو لکھ دیتا ہوں کہ وہ تجھے یہ رقم دے دیں۔ راوی کہتا ہے کہ وہ سائل اس پر راضی نہ ہوا، عدی کو اس پر غصہ آ گیا اور اس نے کہا: بخدا میں تمھیں کچھ بھی نہ دوں گا۔ پھر وہ راضی ہو گیا۔ عدی نے کہا: بخدا اگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ 'جو شخص کسی

رأى أتقى لله منها فليأت التقوى ما حنثت يميني.

بات کی قسم کھائے پھر کوئی دوسری بات اس سے زیادہ پرہیز گاری کی سامنے آ جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس (زیادہ) پرہیز گاری کی بات ہی کو اختیار کرے، تو میں اپنی قسم نہ توڑتا (اور تجھے کچھ نہ دیتا)۔''

مسلم، رقم ۱۶۵۱ میں اسی روایت کی بیان کردہ دوسری سند میں 'ولك أربعمائة فی عطائی' (اور میں تجھے اپنی تنخواہ میں سے چار سو درہم دیتا ہوں) کے الفاظ کا اضافہ ہے۔ اسی مضمون کی بعض روایات مثلاً ابن حبان، رقم ۴۳۴۶ میں 'ما حنثت يمينی' (میں اپنی قسم نہ توڑتا) کے بجائے 'ما حنثت' (میں قسم نہ توڑتا) کے الفاظ ہیں۔ بعض معمولی اختلافات کے ساتھ یہ واقعہ بیہقی، رقم ۱۹۶۳۳ میں بھی بیان ہوا ہے۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۶۹۹۰ میں 'من حلف' (جس نے قسم کھائی) کے بجائے 'فمن حلف' (تو جس نے قسم کھائی) کے الفاظ اور 'فليدع يمينه' (تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی قسم چھوڑ دے) کے بجائے 'فليدعها' (تو اسے چاہیے کہ وہ اسے چھوڑ دے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ اس روایت کی ابتدا میں 'لا نذر و لا يمين فيما لا يملك بن آدم و لا فی معصية الله عز و جل و لا قطيعة رحم' (کوئی نذر اور قسم جائز نہیں اس چیز میں جس کا انسان مالک ہی نہ ہو، نہ اللہ بزرگ و برتر کی معصیت میں اور نہ قطع رحمی میں) کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں اور معمولی فرق کے ساتھ یہی الفاظ ابوداؤد، رقم ۳۲۷۴ اور بیہقی، رقم ۱۹۶۴۴ کی ابتدا میں بھی آئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابوداؤد، رقم ۳۲۷۴ میں 'من حلف' (جس نے قسم کھائی) کی جگہ 'و من حلف' (اور جس نے قسم کھائی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

اسی مضمون کی روایت مسلم، رقم ۱۶۵۰ درج ذیل واقعے کے سیاق میں لائی گئی ہے:

عن أبی هريرة قال أعتم رجل عند النبی صلى الله عليه و سلم ثم رجع إلى أهله فوجد الصبية قد ناموا فأتاه أهله بطعامه فحلف لا يأكل من أجل صبيته ثم بدا له فأكل فأتى رسول الله صلى الله عليه و سلم فذكر ذلك له فقال رسول الله صلى الله عليه و سلم

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو (رات کے وقت) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دیر ہوگئی، پھر جب وہ اپنے گھر گیا تو اس نے بچوں کو سویا ہوا پایا، (اتنے میں) اس کی بیوی اس کے پاس کھانا لائی تو اس نے اپنے بچوں (کے پاس دیر سے آنے) کی وجہ سے کھانا نہ کھانے کی قسم کھا لی، پھر اسے کھانا کھانا مناسب معلوم ہوا تو اس نے کھا لیا۔

من حلف على يمين فرأى غيرها خيرا منها فليأتها وليكفر عن يمينه.

جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو اس نے آپ سے (اپنے اس قسم توڑنے کا) ذکر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ واقعہ سنا) تو فرمایا: جو شخص کوئی قسم کھائے پھر کسی دوسری بات کو اس سے بہتر پائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس بہتر بات ہی کو اختیار کرے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے۔''

اور اسی مضمون کی ایک اور روایت بیہقی، رقم ۱۹۶۲۷ درج ذیل واقعے کے سیاق میں لائی گئی ہے:

عن زهدم الجرمی قال دخلت علی أبی موسی رضی اللّٰه عنه وهو یأکل لحم دجاج فقال ادن فکل فقلت إنی حلفت لا آکله قال ادن فکل وسأخبرك عن یمینك هذه قال فدنوت فأکلت قال أتینا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی ناس من الأشعریین نستحمله فقال لا واللّٰه لا أحملکم وما عندی ما أحملکم علیه قال فما برحنا حتی أتته فرائض غر الذری فأمر لنا منها بحملان فما برحنا إلا یسیرا حتی قلنا ما صنعنا نسینا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یمینه واللّٰه لا نفلح قال فرجعنا إلیه قال ما ردکم قالوا إنك حلفت ألا تحملنا فخشینا أن لا یبارك لنا وخشینا أن نکون نسیناك یمینك قال إنی واللّٰه ما نسیتها ولکن من حلف

''زہدم جرمی سے روایت ہے کہ میں ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا جبکہ وہ مرغی کا گوشت کھا رہے تھے تو انھوں نے کہا کہ (میرے) قریب آ جاؤ اور یہ کھاؤ تو میں نے کہا کہ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ میں یہ (مرغی کا گوشت) نہیں کھاؤں گا۔ انھوں نے کہا: (میرے) پاس آؤ اور کھاؤ، میں تجھے تیری اس قسم کے بارے میں ابھی بتاتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں، میں (ان کے) قریب ہوا اور میں نے کھایا۔ وہ (ابوموسیٰ) کہنے لگے: ہم کچھ اشعریوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سواری مانگنے کے لیے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بخدا میں تمھیں سواری نہیں دوں گا نہ میرے پاس کوئی سواری ہے جو میں تمھیں دوں۔ ہمیں کچھ ہی دیر گزری تھی کہ آپ کے پاس سفید کوہانوں والے زکوٰۃ کے اونٹ آئے تو آپ نے ان میں سے ہودج والے دو اونٹ ہمیں دینے کا حکم دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی ہمیں یہ خیال ہوا کہ ہم نے یہ کیا کر ڈالا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو (ہمیں اونٹ نہ دینے کی) اپنی قسم بھول

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

علـى يـميـن فـرأى غيـرهـا خيرا منها فـليــأت الـذى هـو خيـر وليـكفر عن يمينه.

بھول گئے ہیں۔ بخدا (یہ اونٹ لے کر) ہم کامیاب نہ ہوں گے۔ چنانچہ ہم آپ کے پاس واپس آئے۔ آپ نے (دیکھا تو) فرمایا: کیسے آئے؟ ہم نے کہا: آپ نے قسم کھائی تھی کہ ہمیں سواری نہ دیں گے۔ ہمیں ڈر ہوا کہ ہم (یہ اونٹ لے کر) برکت سے محروم رہ جائیں گے، ہمیں یہ ڈر ہے کہ ہم نے آپ کو آپ کی قسم نہ بھلا دی ہو۔ آپ نے فرمایا: بخدا میں اسے نہیں بھولا، البتہ (بات یہ ہے کہ) جو شخص کوئی قسم کھائے پھر کسی دوسری بات کو اس سے بہتر پائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس بہتر بات کو اختیار کرے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے۔“

۲۔’فـليـدع يمينه وليأت‘ کے الفاظ نسائی، رقم ۳۷۸۶ سے لیے گئے ہیں، اصل روایت میں ان کے بجائے ’فليأت‘ کے الفاظ تھے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ساجد حمید

ذبح کا طریقہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قال[۱] عدی بن حاتم، قلت: یا رسول اللّٰہ، ارایت ان احدنا اصاب صیدا، ولیس معہ سکین، أیذبح بالمروۃ وشقۃ العصا[۲]؟

فقال: امرر الدم بما شئت واذکر اسم اللّٰہ عز و جل. (سنن ابی داؤد، رقم ۲۸۲۴)

عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ کی کیا رائے ہے، اگر ہم میں سے کسی کو کوئی شکار اس حال میں ہاتھ لگے کہ اس کے پاس چھری نہ ہو تو آیا وہ پتھر یا لکڑی کے ٹکڑے سے ذبح کر لے[۱]؟

آپ نے فرمایا: جس چیز سے چاہو خون بہا دو، اور اللہ کا نام اس پر ضرور لو[۲]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ یہ سوال اس لیے کیا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی جو تربیت کی تھی، اس میں انھیں یہ سکھایا تھا کہ کسی کو تکلیف دینا اور ستانا اللہ کو پسند نہیں ہے۔ بندۂ مومن وہ ہے جس سے کسی کو اذیت نہ ہو۔ ایک حدیث میں دیکھیے یہی

اصول جانوروں کے ذبح کے بارے میں بھی واضح کیا گیا ہے:

قال رسول اللّٰہ إن اللّٰہ کتب الإحسان علی کل شیء ... ولیحد احدکم شفرتہ فلیرح ذبیحتہ. (صحیح مسلم، رقم ۱۹۵۵)

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں احسان کو فرض کیا ہے۔ ...اس لیے چاہیے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی چھری کو خوب تیز کرے، تاکہ اس کا ذبیحہ بلا تکلیف ذبح ہو سکے۔''

چنانچہ یہی وہ تربیت ہے جس کی وجہ سے سوال پیدا ہوا کہ جب چھری نہ ہو اور جانور شکار ہو چکا ہے تو کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا کہ پھر جو چیز میسر ہو، اسی سے ذبح کر لو۔ ان دونوں احادیث میں بظاہر تضاد لگتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ مسلم کی محولہ بالا روایت عام حالات سے متعلق ہے، اور زیر بحث ابوداؤد کی روایت خاص صورت حال میں ایک حل پیش کرتی ہے۔ اصل میں شکار سے زخمی جانور کو چھری نہ ہونے کے سبب سے چھوڑ دینا، اس کے لیے زیادہ اذیت ناک ہے۔ اسے جلد سے جلد ذبح کرنا ہی اسے تکلیف سے جلد نجات دے گا۔

۲۔ یہاں چھری کے علاوہ ہر کاٹنے والی چیز کے ذریعے سے ذبح کرنے کی اجازت دی ہے، لیکن اس کے ساتھ دو باتوں کا ذکر کیا ہے: ایک خون بہا دینے کا اور دوسرے اللہ کا نام لینے کا۔ تذکیہ یا ذبح کرنے کے شرعی طریقے کی یہی دو بنیادی چیزیں ہیں جس سے ذبیحہ حلال ہو گا۔ جانور کو ایسے طریقے سے ذبح کیا جائے کہ جس سے مرنے سے پہلے اس کا سارا خون بہ کر نکل جائے اور دوسرے یہ کہ اس پر اللہ کا نام لیا جائے۔ اسے اسلامی اصطلاح میں 'تذکیہ' کہتے ہیں۔ سورۂ مائدہ میں اسی طریقے کے ذبیحہ کو کھانے کے لیے حلال قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالۡمُنۡخَنِقَةُ وَالۡمَوۡقُوۡذَةُ وَالۡمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيۡحَةُ وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيۡتُمۡ. (المائدہ ۵:۳)

''تم پر مردار، خون، سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام ہے، اور (مردار میں یہ بھی کہ) جو گلا گھٹنے سے مرا ہو، جو چوٹ لگنے سے مرا ہو، جو گر کر مرا ہو، جو سینگ لگنے سے مرا ہو، یا جسے کسی شکار نے چیر ڈالا ہو، سب حرام ہیں، سوائے ان کے جن کا تم نے 'تذکیہ' کر لیا ہو۔''

ہماری زیر بحث روایت اسی تذکیہ کی شرح کرتے ہوئے، اس کی اجازت دے رہی ہے کہ جہاں تیز دھار چھری سے ذبح کرنا ممکن نہ ہو، وہاں جو چیز بھی چاہو ذبح کے لیے استعمال کر لو، لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ جانور کا خون بہ جانا چاہیے اور اس پر اللہ کا نام بھی لینا چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

متن کے حواشی

۱۔سنن البیہقی ،رقم ۱۸۹۲۷ میں یہی روایت ان الفاظ میں آئی ہے:'یا رسول اللّٰہ ان احدنا اذا اصاب صیدا ولیس معه شفرة ایذکی بمروة او شقة العصا قال امرر الدم بما شئت واذکر اسم اللّٰہ عز و جل'(اے رسول اللہ،اگر ہم میں سے کوئی کسی شکار کو پائے،اوراس کے پاس چھری نہ ہوتو کیا وہ کسی دھاردار پتھر سے یا لکڑی کے ٹکڑے سے ذبح کر لے؟ آپ نے فرمایا:جس چیز سے چاہو خون بہا دو،اوراس پر اللہ تعالیٰ کا نام لو۔)

۲۔ابن ماجہ،رقم ۳۱۷۷،مسند احمد،رقم ۱۸۲۷۶ اور المستدرک للحاکم ،رقم ۷۶۰۰ میں عدی کا سوال یوں نقل ہوا ہے:'یا رسول اللّٰہ انا نصید الصید فلا نجد سکینا الا الظرار وشقة العصا'اس روایت کے الفاظ سب میں ایک سے ہیں۔(اے اللہ کے رسول،ہم شکار کر لیتے ہیں،لیکن یہ ہوتا ہے کہ ہمارے پاس ذبح کے لیے چھری نہیں ہوتی،بس کوئی دھاروالا پتھر یا نوک والی لکڑی ہوتی ہے۔)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ایمانیات

(۱۷)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

روز جزا پر ایمان

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا، وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا، وَقَالَ الْاِنْسَانُ: مَالَهَا؟ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا، بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا، يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ، فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ.(الزلزال ۹۹:۱-۸)

''(یہ اُس دن کو یاد رکھیں) جب زمین ہلا دی جائے گی، جس طرح اُسے ہلانا ہے۔ اور زمین اپنے سب بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی، اور انسان کہے گا: اس کو کیا ہوا؟ اُس دن تیرے پروردگار کے ایما سے، وہ اپنی سب کہانی کہہ سنائے گی۔ اُس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے، اِس لیے کہ اُن کے اعمال اُنھیں دکھائے جائیں۔ پھر جس نے ذرہ برابر بھلائی کی ہے، وہ بھی اُسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہے، وہ بھی اُسے دیکھ لے گا۔''

دین جن حقائق کو ماننے کا مطالبہ کرتا ہے، ان میں روز جزا کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت میں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ تمام شریعت، نیکی اور خیر کی اساس یہی عقیدہ ہے۔ نبوت و رسالت کی بنا اسی پر قائم ہے۔ نبی اس لیے نبی ہے کہ وہ اس نباء عظیم کی خبر دیتا ہے۔ رسول اس لیے رسول ہے کہ وہ اس کا پیغام لے کر آتا

ہے۔ یوحنا و مسیح اور ابراہیم و موسیٰ، سب نے اس کی منادی کی ہے۔ تورات میں اس کے اشارے ہیں، زبور میں اس کی تصریحات ہیں۔ انجیل میں سیدنا مسیح نے خبردار کیا ہے کہ اس دن وہی لوگ خدا کی بادشاہی میں داخل ہوں گے جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتے ہیں۔ قرآن اسی روز جزا کے لیے ایک صحیفۂ انذار و بشارت ہے۔ وہ لوگوں کو بتاتا ہے کہ جس طرح تم سو کر اٹھ جاتے ہو[88]؛ جس طرح مردہ زمین پر پانی برستا ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے زندہ ہو جاتی ہے[89]؛ جس طرح تم کچھ نہیں ہوتے، مگر ایک قطرۂ آب سے جیتے جاگتے انسان بن جاتے ہو[90]، اسی طرح ایک دن قبروں سے اٹھا کر زندہ کر دیے جاؤ گے۔ اس میں تمھارے پروردگار کو ذرا بھی مشکل پیش نہ آئے گی۔ اس کے مخاطبین اسے مستبعد سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ان سڑی ہوئی بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا تو وہ جواب دیتا ہے کہ وہی جس نے پہلی مرتبہ انھیں بنایا تھا[91]۔ ایک لفظ بولنا جتنا آسان ہے، اس کے لیے یہ اتنا ہی آسان ہے:

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ، اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ. (الذاریات ۵۱: ۲۳)

''پس زمین و آسمان کے پروردگار کی قسم، یہ واقع ہو کر رہے گی، بالکل اسی طرح، جس طرح تم بول دیتے ہو۔''

وہ کہتا ہے کہ یہ تمھاری فطرت کا تقاضا ہے، تمھارے اندر خیر و شر کے شعور کا تقاضا ہے، انصاف کے لیے تمھاری طلب کا تقاضا ہے۔ تم خدا کو مانتے ہو تو یہ اس کے عدل کا تقاضا ہے، اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے، اس کی رحمت، قدرت اور حکمت کا تقاضا ہے، اس کے قوانین اور سنن کا تقاضا ہے۔ اس پر ایمان کے بغیر دین خواہش نفس کے سوا کچھ نہیں۔ نیکی، تقویٰ، عدل و قسط اور جزا و سزا کے تمام تصورات بالکل بے معنی ہیں۔ یہ دن نہ ہو تو کائنات کھلنڈرے کا کھیل، رام کی لیلا اور یزداں کی تماشا گاہ بن کر رہ جائے۔

اس دن کے شواہد، علامات اور احوال و مقامات قرآن و حدیث، دونوں میں مذکور ہیں۔ انھیں ہم یہاں بیان کریں گے۔

شواہد

پہلی چیز انسان کے اندر خیر و شر کا شعور ہے۔ یہ اسی شعور کا نتیجہ ہے کہ اس کے ضمیر میں ایک نگران ہر وقت اس کی

۸۸۔ الزمر ۳۹: ۴۲۔

۸۹۔ الاعراف ۷: ۵۷۔ فاطر ۳۵: ۹۔

۹۰۔ القیامہ ۷۵: ۳۶-۴۰۔

۹۱۔ یٰس ۳۶: ۷۸۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

برائیوں پر اسے متنبہ کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک چھوٹی عدالت ہے جو انسان کے اندر قائم ہے اور ہر موقع پر اپنا بے لاگ فیصلہ سناتی ہے۔ انسان اس فیصلے کو مانے یا نہ مانے، وہ فکر و خیال اور علم و عمل کی ہر لغزش کے بعد اسے سنتا ضرور ہے، یہاں تک کہ اس کی بدنفسی اس قدر بڑھ جائے کہ اعمال کی سیاہی اس کے دل کا احاطہ کر کے اس کو بالکل اندھا بہرا کر دے۔ یہ انسان کے اوپر خود اس کے باطن کی گواہی ہے جسے نفس لوامہ کی شہادت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن اسے پیش کرتا اور انسان کو بتاتا ہے کہ تم کوئی شتر بے مہار نہیں ہو کہ جو چاہے کرتے رہو، تم سے کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح یہ قیامت صغریٰ خود تمھارے اندر برپا ہے، اسی طرح پوری کائنات کے لیے بھی ایک قیامت لازماً برپا ہو گی جس میں تم اپنے پروردگار کے حضور میں جواب دہ ٹھیرائے جاؤ گے اور جو کچھ تم نے کیا ہو گا، اس کے لحاظ سے تمھارے لیے جزا و سزا کا فیصلہ ہو گا۔ تم اسے نہیں مانتے تو اپنے آپ کو جھٹلاتے اور اپنے ضمیر کے روبرو شرارت کرتے ہو:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لَا اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ، وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ، اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ؟ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ، بَلۡ یُرِیۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِیَفۡجُرَ اَمَامَهٗ، یَسۡـَٔلُ اَیَّانَ یَوۡمُ الۡقِیٰمَةِ؟ فَاِذَا بَرِقَ الۡبَصَرُ وَ خَسَفَ الۡقَمَرُ، وَ جُمِعَ الشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ، یَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ: یَوۡمَئِذٍ اَیۡنَ الۡمَفَرُّ؟ کَلَّا لَا وَزَرَ، اِلٰی رَبِّكَ یَوۡمَئِذِ الۡمُسۡتَقَرُّ، یُنَبَّؤُا الۡاِنۡسَانُ یَوۡمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ، بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰی نَفۡسِهٖ بَصِیۡرَةٌ، وَّلَوۡ اَلۡقٰی مَعَاذِیۡرَهٗ.

(القیامہ ۷۵: ۱-۱۵)

”نہیں، میں قیامت کے دن کو گواہی میں پیش کرتا ہوں اور نہیں، میں (تمھارے) اِس نفس لوامہ کو گواہی میں پیش کرتا ہوں۔ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں، ہم تو اس کی پور پور درست کر سکتے ہیں۔ (نہیں، یہ بات نہیں)، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) انسان اپنے ضمیر کے روبرو شرارت کرنا چاہتا ہے۔ پوچھتا ہے: قیامت کب آئے گی؟ لیکن اُس وقت، جب دیدے پتھرائیں گے اور چاند گہنائے گا اور سورج اور چاند، (یہ دونوں) اکٹھے کر دیے جائیں گے تو یہی انسان کہے گا کہ اب کہاں بھاگ کر جاؤں — ہرگز نہیں، اب کہیں پناہ نہیں! اُس دن تیرے رب ہی کے سامنے ٹھیرنا ہو گا۔ اُس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اُس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا ہے۔ (نہیں، وہ اسے نہیں جھٹلا سکتا)، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) انسان خود اپنے اوپر

گواہ ہے، اگرچہ کتنے ہی بہانے بنائے۔''

دوسری چیز انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ عدل کو چاہتا اور ظلم سے نفرت کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے باوجود وہ ظلم کرتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انسان ظلم اور عدل میں فرق کرنے سے قاصر ہے یا ظلم سے محبت کرتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ جذبات و خواہشات سے مغلوب ہو کر وہ اپنے نفس کا توازن کھو بیٹھتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ انسان دوسروں کے گھر میں نقب لگاتا ہے، مگر کبھی نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا اس کے گھر میں نقب لگائے، دوسروں کو قتل کرتا ہے، مگر کبھی پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کی یا اس کے اعزہ واقربا میں سے کسی کی جان لے، دوسروں کے لیے کم تولتا ہے، مگر کم تلوانے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوتا۔ انھی چوروں، قاتلوں اور ڈنڈی مارنے والوں سے پوچھیے تو وہ اعتراف کریں گے کہ ان میں سے ہر چیز ایک جرم ہے اور اسے ختم ہونا چاہیے۔ لہٰذا کوئی انسان بہ قائمی ہوش وحواس اس بات پر راضی نہیں ہو سکتا کہ نیک و بد کو یکساں سمجھا جائے اور دونوں سے ایک ہی معاملہ کیا جائے۔ قرآن یہ حقائق سامنے رکھتا اور منکرین قیامت سے پوچھتا ہے:

اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ؟ مَا لَکُمۡ، کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ؟ (القلم ۶۸: ۳۵-۳۶)	''پھر کیا ہم فرماں برداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا حکم لگاتے ہو؟''

تیسری چیز انسان اور کائنات، دونوں کی ناتمامی ہے۔ انھیں جس پہلو سے دیکھیے، صاف نظر آتا ہے کہ ایک طرف ان کے ایک ایک جزو سے ان کے بنانے والے کی عظیم قدرت اور عظیم حکمت نمایاں ہے۔ ہر چیز میں اتھاہ معنویت، بے نظیر نظم و ترتیب، بے مثال ریاضی اور اقلیدس، غیر معمولی اہتمام اور بے پناہ تخلیقی حسن علم و عقل کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ دوسری طرف بحیثیت مجموعی ان دونوں کو سمجھنے کی کوشش کیجیے تو آخری درجے میں مایوس کر دینے والی ناتمامی اور بے مقصدیت سامنے آتی ہے۔ تمہیدی مباحث میں ہم اس کے ایک ایک پہلو کی تفصیل کر چکے ہیں۔ اس کے بعد دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ اس کارخانۂ ہستی کو عبث قرار دے کر فیصلہ کیا جائے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ اس کو ایک روز جزا اور خدا کی اس ابدی بادشاہی کے ساتھ ملا کر سمجھا جائے جس کی منادی انبیا علیہم السلام نے کی ہے۔ علم و عقل کا فیصلہ کیا ہے؟ ہر شخص سمجھ سکتا ہے:

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا، وَّاَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ، فَتَعٰلَی اللّٰہُ الۡمَلِکُ الۡحَقُّ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ، رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡکَرِیۡمِ. (المومنون ۲۳: ۱۱۵-۱۱۶)	''تو کیا یہ گمان رکھتے ہو کہ ہم نے تمھیں بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟ سو بڑی ہی برتر ذات ہے اللہ بادشاہ حقیقی کی، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عرش کریم کا مالک ہے۔''

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ، وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ، لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا، لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ، اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ. (الانبیاء۲۱:۱۶-۱۷)

''اور زمین و آسمان کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ہم نے کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ ہم کوئی کھیل بنانا چاہتے تو اپنے پاس ہی بنا لیتے، اگر ہم یہی کرنے کا ارادہ کر لیتے۔''

استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ اس (بات) کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اگر اس دنیا کے پیچھے کوئی روز جزا و سزا نہیں ہے۔ یہ یوں ہی چلتی آئی ہے اور یوں ہی ہمیشہ چلتی رہے گی۔ کوئی نیکی کرے یا بدی، ظلم کرے یا انصاف، اس کے خالق کو اس کے خیر و شر سے کوئی بحث نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے یہ محض اپنا جی بہلانے کے لیے ایک کھیل تماشا بنایا ہے، جب تک وہ چاہے گا، اس سے جی بہلائے گا اور جب اکتا جائے گا، اس کی بساط لپیٹ کر رکھ دے گا اور اپنی دل چسپی اور اوقات گزاری کے لیے کوئی نیا کھیل ایجاد کر لے گا۔ فرمایا کہ ہم نے ان آسمان و زمین اور اس کے مابین کی چیزوں کو اس طرح کے کسی کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ یہ کارخانۂ کائنات اپنے وجود سے شاہد ہے کہ یہ ایک عادل و حکیم اور رحمٰن و رحیم کا بنایا ہوا کارخانہ ہے۔ نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، نہ یہ دیوتاؤں کی رزم گاہ ہے اور نہ یہ کسی بھگوان کی لیلا ہے، بلکہ اس پر حکمت کارخانے کی ایک ایک چیز شاہد ہے کہ اس کے خالق نے اس کو ایک عظیم مقصد و غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کے عدل و حکمت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے، جس میں اس کا مقصد ظہور میں آئے۔'' (تدبر قرآن ۵/۱۳۲)

چوتھی چیز صفات الٰہی ہیں جن کے آثار اس کائنات کے ذرے ذرے میں نمایاں ہیں۔ ربوبیت اور رحمت کی صفات ان میں بالخصوص قابل توجہ ہیں۔ عالم کے پروردگار کی طرف سے انسان کی پرورش کا جو غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہے، اسے دیکھنے کے بعد کوئی عاقل کس طرح باور کر سکتا ہے کہ اس کا خالق اسے غیر مسئول چھوڑ دے گا اور رحمٰن و رحیم خدا سے یہ توقع کس طرح کی جا سکتی ہے کہ جن لوگوں نے دنیا کو ظلم و عدوان کا گھر بنا دیا ہے، وہ انھیں کوئی سزا نہ دے گا۔ قرآن نے اسی بنا پر جگہ جگہ توجہ دلائی ہے کہ قیامت اللہ تعالیٰ کی رحمت، ربوبیت اور قدرت و حکمت کا تقاضا ہے۔ خدا کو ماننے کے بعد کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

انعام میں فرمایا ہے:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ، لَا رَيْبَ فِيْهِ. (۶:۱۲)

''اُس نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے۔ وہ تمھیں ضرور جمع کر کے قیامت کے دن کی طرف لے جائے گا، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سورۂ نبا میں ہے:

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا، وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا، وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجاً، وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتاً، وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاساً وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشاً، وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعاً شِدَادًا، وَّجَعَلْنَا سِرَاجاً وَّهَّاجاً، وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجاً، لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبّاً وَّنَبَاتاً، وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافاً، اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتاً. (۷۸: ۶-۱۷)

’’(یہ دیکھیں تو سہی)، کیا ہم نے زمین کو گہوارہ اور پہاڑوں کو (اِس کی) میخیں نہیں بنایا؟ اور تم کو جوڑوں کی صورت میں پیدا نہیں کیا؟ اور (تمھارے لیے) تمھاری نیند کو باعث راحت نہیں بنایا؟ اور رات کو لباس اور دن کو وقت معاش نہیں بنایا؟ اور تمھارے اوپر سات محکم (آسمان) نہیں بنائے؟ اور (اِن میں) ایک دہکتا چراغ، (یہ سورج) نہیں بنایا؟ اور نچڑتی بدلیوں سے چھاجوں مینہ نہیں برسایا کہ اِس سے اناج اور سبزہ اور گھنے باغ اگائیں؟ ـــــ (یہ سب، منادی کر رہا ہے کہ) بے شک فیصلے کا دن مقرر ہے۔‘‘

اسی طرح ق میں فرمایا ہے:

اَفَلَمْ يَنظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ، كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا، وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ، وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا، وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ، وَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ، تَبْصِرَةً وَذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ، وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا، فَاَنْبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ، وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ، رِّزْقاً لِّلْعِبَادِ، وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتاً، كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ. (۵۰: ۶-۱۱)

’’پھر کیا اِنھوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا، کس طرح ہم نے اُسے بنایا اور اُسے سنوارا ہے اور (نہیں دیکھا کہ) اُس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا اور پہاڑ گاڑ دیے اور اُس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اگا دیں۔ ہر اُس بندے کی بصیرت اور یاددہانی کے لیے جو رجوع کرنے والا ہو۔ اور آسمان سے ہم نے برکتوں والا پانی برسایا ہے، پھر اُس سے باغ اُگائے اور فصل کے غلے اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت بھی جن میں تہ بر تہ خوشے لگتے ہیں، بندوں کی روزی کے لیے۔ اور اُس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ (زمین سے تمھارا) نکلنا بھی اسی طرح ہو گا۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ اللہ تعالیٰ نے مکذبین قیامت کو اپنی قدرت، ربوبیت اور حکمت کی ان بدیہی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو اوپر اور نیچے ہر جگہ نظر آتی ہیں اور ہر اس شخص کے اندر بصیرت اور یاددہانی پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں جس کے سینے میں اثر پذیر اور متوجہ ہونے والا دل ہو۔

سب سے پہلے اپنی عظیم قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی کہ کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی کہ دیکھتے کہ کس طرح ہم نے اس کو بلند کیا، اس کو ستاروں سے سجایا اور ہماری قدرت و حکمت کا اعجاز ہے کہ ایسی ناپیدا کنار چھت میں کہیں کسی رخنہ کی نشان دہی وہ نہیں کر سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کی قدرت و حکمت کا یہ کرشمہ وہ اپنے سروں پر دیکھتے ہیں، کیا اس کے لیے ان کے مرنے کے بعد ان کو دوبارہ پیدا کر دینا مشکل ہو جائے گا؟

اس کے بعد قدرت و حکمت کے ساتھ اپنی ربوبیت اور پرورش کے اہتمام کی طرف بھی توجہ دلائی۔ فرمایا کہ وہ اپنے نیچے دیکھیں کہ کس طرح ہم نے زمین کو ان کے قدموں کے نیچے بچھایا ہے اور اس کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے اندر پہاڑوں کی میخیں گاڑ دی ہیں اور اس میں طرح طرح کی چیزیں اگا رکھی ہیں جو ان کی غذا کے کام آتی ہیں اور جن کی خوش منظری ان کی باصرہ نوازی بھی کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس پروردگار کی قدرت و حکمت اور جس کی پروردگاری کی یہ شانیں وہ دیکھ رہے ہیں، کیا اس کے لیے دشوار ہے کہ وہ ان کے مر جانے کے بعد ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے؟ کیا جس پروردگار نے ان کی پرورش کا یہ اہتمام کر رکھا ہے، وہ ان کو اسی طرح چھوڑے رکھے گا کہ وہ کھائیں، پئیں، عیش کریں، ان سے کبھی اس باب میں کوئی پرسش نہیں ہو گی؟''

(تدبر قرآن ۷/۵۳۸)

پانچویں چیز دنیا میں خدا کی دینونت کا ظہور ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد ان کی قوموں کے لیے ایک قیامت صغریٰ اسی دنیا میں برپا کر دی جاتی ہے۔ ایمان و عمل کی بنیاد پر قیامت میں جزا و سزا کے جس معاملے کی خبر دی گئی ہے، وہ ان کی قوموں کے ساتھ اسی دنیا میں ہو جاتا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو بھی اللہ تعالیٰ نے صدیوں سے اسی دینونت کا نمونہ بنا رکھا ہے۔ اس کے لیے سنت الٰہی یہ ہے کہ یہ اگر حق پر قائم ہو اور اسے بے کم و کاست دنیا کی سب قوموں تک پہنچاتی رہے تو ان کے نہ ماننے کی صورت میں اللہ تعالیٰ ان قوموں پر اسے غلبہ عطا فرماتے ہیں اور اس سے انحراف کرے تو انھی کے ذریعے سے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل، دونوں اس وقت اسی عذاب سے دوچار ہیں۔ اس سنت الٰہی کے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بارے میں قرآن کے ارشادات ہم اس سے پہلے نقل کر چکے ہیں۔ یہ اس بات کی قطعی شہادت ہے کہ انبیا علیہم السلام نے جس قیامت کی خبر دی ہے، وہ بھی اسی طرح ایک دن برپا ہو کر رہے گی۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سیرت النبی

خالد مسعود

بعثت اور دعوت دین کا آغاز

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

آغاز وحی

اوپر یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ صحابہ کے زمانہ ہی میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کون سی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ بعض لوگ سورۃ العلق کی ابتدائی آیات کو پہلی وحی مانتے تھے، لیکن جابر بن عبداللہ کو اصرار تھا کہ میں نے بطور خاص خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ حضور نے بتایا کہ میں حسب معمول غار حرا میں ایک ماہ مقیم رہا۔ جب یہ مدت ختم ہوئی تو میں پہاڑ سے اترا۔ وادی میں مجھے یوں لگا کہ کسی نے مجھے پکارا ہے۔ میں نے آگے پیچھے اور دائیں بائیں مڑ کر دیکھا، لیکن کوئی شخص نظر نہ آیا۔ پھر ندا آئی تو میں نے سر اٹھایا، کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا، ہوا میں ایک تخت پر پورے شکوہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس منظر سے میرے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی[۱]۔ چنانچہ میں گھر کو لوٹا اور کہا کہ مجھے چادر اوڑھا دو۔ بعض روایات میں ہے کہ فرشتہ افق سے اترنے لگا اور مجھ سے اتنا قریب ہو گیا جتنا استاد اپنے شاگرد سے قریب ہوتا ہے۔ تب اس نے جھک کر پورے التفات واہتمام کے ساتھ وحی پہنچائی۔

۱؎ صحیح مسلم۔ باب بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ۱/۸۰۔

ہمارے نزدیک یہ موقع ہے جب حضور کو خلعت رسالت سے نوازا گیا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن نے بھی بڑے اہتمام سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ فرشتہ کو دیکھنا اور اس سے وحی حاصل کرنا ایک ایسا معاملہ تھا جس میں آپ کے واہمہ یا تخیل کو کوئی دخل نہ تھا۔ آپ کی عقل وفہم نے وحی کے پیغام کو سمجھنے میں ذرا بھی غلطی نہیں کی۔ فرشتہ نے اس موقع پر اللہ کا وہ پیغام پہنچایا جو اس موقع پر آپ کو پہنچانا مقصود تھا[۲]۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ باقاعدہ جاری ہو گیا۔

رہی یہ بات کہ پہلی وحی کن آیات پر مشتمل تھی تو اس بارے میں متعین طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم اگر حضرت جابر کی روایت پر انحصار کیا جائے تو پہلی وحی یوں تھی:

یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَاَنْذِرْ. وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ. وَ ثِیَابَکَ فَطَھِّرْ. وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ. (المدثر ۷۴: ۱-۵)

''اے چادر اوڑھنے والے، اٹھ اور لوگوں کو خبر دار کر۔ اپنے رب کی بڑائی بیان کر، اپنے دامن کو پاک رکھ اور ناپاکی سے دور رہ۔''

ہمارے نزدیک یہ آیات ایسی ہیں جو وحی کا نقطۂ آغاز بن سکتی ہیں۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ذمہ داری سے گھبرا کر چادر میں لپٹ جانے کے بجائے اٹھ کر لوگوں کا سامنا کرنے، ان کے آگے صرف اللہ کی کبریائی کا چرچا کرنے اور شرک کی نجاست سے دور رہنے کی تلقین ہے۔ ان میں نبی کی اصل ذمہ داری انذار کا واضح ذکر موجود ہے۔ جس کا مطلب ہے لوگوں کو اللہ کی ہدایت کی طرف بلانا اور اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو اس کے برے نتائج سے خبر دار کرنا اور ڈرانا۔

پہلی وحی حضور پر ماہ رمضان میں لیلۃ القدر میں نازل ہوئی۔ یہ بات قرآن مجید کی نص سے ثابت ہے۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے اہم امور کے لیے یہ رات مخصوص کی ہوئی ہے اور نزول قرآن چونکہ انسانیت کی بھلائی کے لیے سب سے اہم پروگرام تھا، اس لیے ہزار ماہ سے بھی زیادہ قیمتی رات لیلۃ القدر میں اس کا اہتمام فرمایا گیا۔ مزید انتظام یہ کیا گیا کہ جبریل امین کو بارگاہ خداوندی سے رسول اللہ تک وحی پہنچانے میں جو شیطانی قوتیں، خصوصاً جنات، مزاحم ہو سکتی تھیں، ان کی افلاک میں آمد ورفت کو روکنے کے لیے پہرے لگا دیے گئے۔

چونکہ فرشتۂ وحی کی پہلی آمد، جو روشناسی کے مقصد سے تھی، اور دوسری آمد میں، جو فی الواقع حضور کی بعثت کی خبر دینے کے لیے تھی، چند ہفتوں کا وقفہ تھا، اس کو فترۃ الوحی سے تعبیر کر لیا گیا اور پھر اس کی مدت تین سال تک پھیلا دی گئی۔ حالانکہ قابل غور بات یہ ہے کہ اگر رسالت کے کام کو شروع کرانے کے بعد تین سال تک معطل ہی کرنا تھا تو

---

۲ سورۃ النجم ۵۳: ۱-۱۰۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس کا آغاز ہی کیوں کیا گیا۔ اس کی کوئی مصلحت تو ہونی چاہیے۔ ہمارے نزدیک حضرت جابر کی روایت مبنی برحقیقت ہے۔ وحی میں کوئی انقطاع نہیں ہوا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو پہلے دن ہی سے وحی کا آغاز ہو گیا اور آپ اس کی روشنی میں دعوت دین دینے لگے۔

کیفیت وحی

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی نازل ہونے سے پہلے آپ گھنٹی کی آواز سنتے یا آپ کو مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے ملتی جلتی آواز سنائی دیتی۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تو انھی آوازوں سے الفاظ وحی کی تراوش ہوتی۔ اس کیفیت میں آپ کا جسم پسینہ سے شرابور ہو جاتا اور اعضا پر کپکپی سی طاری ہو جاتی۔ جب یہ کیفیت ختم ہوتی تو آپ کے ذہن میں وحی کے الفاظ محفوظ ہو چکے ہوتے تھے[۳]۔

نبی کے جسم پر طاری ہونے والی یہ کیفیات دیکھنے والوں کو نظر آتیں، لیکن نبی کے باطن میں کیا ہو رہا ہوتا، اس کو جاننے کا کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل امین کے درمیان کا معاملہ ہوتا۔ گھنٹی کی آواز یا بھنبھناہٹ بھی صرف حضور ہی سنتے۔ آپ کے ساتھی اس سے بے خبر ہوتے۔ ہوسکتا ہے یہ آواز آپ کو متوجہ کرنے کے لیے آتی ہو اور اس وقت تک جاری رہتی ہو، جب تک پیغام وحی مکمل نہ ہو جاتا ہو۔ جہاں تک جسمانی تغیرات کا تعلق ہے یہ اس لیے واقع ہوتے کہ رسول اللہ کا رابطہ عالم ناسوت سے نکل کر عالم لاہوت میں فرشتہ کے ساتھ ہوتا۔ آپ کو اس میں غیر معمولی مشقت پیش آتی۔ اس کیفیت کو بدطینت مستشرقین نے العیاذ باللہ مرگی کے دورہ کا نام دیا ہے، جبکہ مرگی کا مریض دورہ پڑنے پر بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے اور اس کے لیے دورہ کی کیفیت سے نکلنے کے بعد ڈھنگ سے باتیں کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ پیغمبر وحی اترنے کی حالت میں بے ہوش نہیں ہوتے تھے۔ اس کیفیت سے نکلنے کے بعد زندگی بخش معجز کلام آپ کی زبان سے ادا ہوتا اور آپ فوراً اس کی رہنمائی میں ساتھیوں کو نئی ہدایات دیتے اور پیش آمدہ مسائل کو حل فرماتے۔ وحی آپ کے لیے قوت اور تسکین کا باعث بنتی اور آپ کو اپنے کام کے لیے ولولہ تازہ مہیا کرتی۔ وحی شدہ کلام آپ اپنے دوست و دشمن، حلیف و حریف سب کو گوش گزار کرنے پر مامور تھے۔ اس لیے آپ کو نئی وحی نازل ہونے کا ہمیشہ انتظار رہتا۔

---

۳ صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.net

دعوت کا آغاز

جب کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے تو وہ اس قوم کو مخاطب کر کے اللہ کا یہ پیغام دیتا ہے کہ لوگ اپنے غلط عقیدہ وعمل کو چھوڑ کر اللہ کے بندے بن جائیں۔ اس مقصد کے لیے وہ لوگوں کی فطری نیکی کو ابھارتا، غلط کاموں پر متنبہ کرتا، نصیحت وموعظت کے ذریعے سے ان کو خدا کی بتائی ہوئی راہ راست کو اختیار کرنے کی تلقین کرتا اور قوم کی فکری وعملی رہنمائی کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی کام خفیہ کرنے کا نہیں ہوتا۔ رسول کی ذمہ داری کی نوعیت سازش کر کے انقلاب برپا کرنے کی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی جدوجہد کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر رکھے اور اپنی جماعت کھڑی کر کے ایسے افراد مہیا کرے جو قوم کے اندر رائج نظام کو تلپٹ کر کے اس کے تجویز کردہ نظام کو نافذ کر دیں۔ رسول کے کام کی نوعیت ہی کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ اس بات کا آرزومند ہو کہ ساری قوم اس کی آواز پر لبیک کہہ دے، لیکن عملاً اس کو اس بات کی زیادہ پروا نہیں ہوتی کہ اس کا ساتھ دینے والے کون اور کس حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ کل کتنے تھے اور آج ان کی تعداد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض رسولوں پر ایمان لانے والے چند ہی افراد ہوئے، باقی ساری قوم نے ان کا انکار کیا، تاہم رسول اپنا فریضہ ادا کرنے میں کامران ہوئے۔

رسول دین کی دعوت اپنی کسی غرض کو پورا کرنے کے لیے نہیں دے رہا ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری مالک ارض وسما اس کے سپرد کرتا ہے۔ جو اس کو کام کرنے کا پلان بھی عطا کرتا ہے۔ پیغمبر اسی پلان کی حدود میں رہ کر کام کرتا ہے اور جب اس کا قدم ان حدود سے باہر جانے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ رہنمائی کرتا اور اس کو واپس پلان کی حدود میں لے آتا ہے۔ چونکہ پیغمبر کا کام جان جوکھم میں ڈالنے کا ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لیتا ہے۔ ہر مشکل وقت میں وہی اس کی دست گیری فرماتا ہے۔ لہٰذا رسول کو کسی بھی مرحلہ پر اپنی قوم کے کسی سخت ردعمل سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی دعوت کو خفیہ رکھنے پر مجبور ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر میں تھے تو ان کے ہاتھوں ایک قبطی کے قتل کا واقعہ پیش آ گیا جس میں ان کے ارادہ کو کوئی دخل نہ تھا۔ چونکہ فرعون کو بنی اسرائیل سے بیر تھا، اس لیے موسیٰ علیہ السلام کو اس قتل کا ذمہ دار گردانا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب رسالت سے سرفراز فرمایا تو ساتھ ہی ان کو حکم ہوا کہ فرعون کے دربار میں جا کر میرا پیغام پہنچاؤ، وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے کوئی خفیہ منصوبہ تیار نہیں کیا، بلکہ بے دھڑک فرعون کے پاس چلے گئے۔ فرعون نے ان کے پچھلے جرم کا حوالہ دیا اور یہ امکان بھی تھا کہ وہ ان کو گرفتار کر لے، مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد تھا:

لَا تَخَافَآ اِنَّنِی مَعَکُمَآ اَسۡمَعُ وَاَرٰی. (طٰہٰ ۲۰:۴۶)

''تم دونوں (یعنی موسیٰ و ہارون علیہما السلام) اندیشہ مت کرو۔ میں تمھارے ساتھ ہوں، میں سنتا اور دیکھتا ہوں۔''

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عظیم المرتبت خاتم الانبیا کے بارے میں آپ کے سیرت نگاروں نے یہ تاثر کیسے پھیلا دیا، اور امت نے اس کو قبول کیسے کر لیا کہ بعثت کے بعد تین سالوں تک آپ نے خفیہ تبلیغ کی۔ یہ بات رسولوں کی سنت سے مطابقت نہیں رکھتی اور حقائق کے بھی منافی ہے۔ اگر آپ نے قریش کی مخالفت کے خوف سے ایسا کیا تو کیا اللہ تعالیٰ کی وہ حفاظت آپ کو حاصل نہ تھی جو تمام رسولوں کو حاصل رہی ہے؟ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ تین سالوں کے بعد جب آپ نے علانیہ تبلیغ شروع کی تو کیا اس وقت قریش کی عداوت ختم ہو چکی تھی؟ یا کیا اس عرصہ کے دوران میں آپ نے چوری چھپے اتنی نفری مہیا کر لی تھی کہ آپ قریش کے مدمقابل بن کر آ سکتے؟ تاریخ گواہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عرصہ میں دعوت کو لوگوں کے علم میں لانے میں رکاوٹ پیدا کی تو یہ اللہ تعالیٰ کی ڈالی ہوئی ذمہ داری کے ادا کرنے میں کوتاہی تھی جو حضور کی عظمت و شان کے منافی ہے۔ خفیہ تبلیغ کی کوئی اور حکمت سیرت نگار بیان نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک آپ کی جدوجہد کا کوئی دور خفیہ نہیں رہا۔ آپ نے دعوت دین کا کام ٹھیک اس پلان کے مطابق کیا جو آپ کو اللہ رب العزت کی طرف سے دیا گیا تھا اور اس میں ایک تدریج ملحوظ رکھنے کا حکم تھا۔ فرمایا گیا:

وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ. فَاِنۡ عَصَوۡکَ فَقُلۡ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ وَ تَوَکَّلۡ عَلَی الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ. (الشعراء ۲۶: ۲۱۴-۲۱۷)

''اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈراؤ اور جن اہل ایمان نے تمھاری پیروی کی ہے، ان کے لیے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھو، اگر یہ لوگ تمھاری نافرمانی کریں تو ان کو سنا دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، میں اس سے بری ہوں اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسا رکھو۔''

اس پلان کے مطابق دعوت دین کا آغاز آپ نے اپنے قریبی خاندان یعنی قریش سے کرنا تھا، جو لوگ دعوت قبول کرتے، ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کرنا اور ان کو کفار کے نرغے سے نکالنا تھا۔ بعد کے مرحلہ میں دعوت کو پورے زور و قوت کے ساتھ بلند آہنگ ہو کر پیش کرنا اور شرک پر جمے ہوئے ان لوگوں سے، جو آپ کی بات نہ سنیں، اعلان برأت کرنا تھا۔ اس پورے کام میں ہدایت یہ تھی کہ آپ محض اللہ پر بھروسا کریں جو زبردست اور اپنے

ارادوں کو بروئے کار لانے پر قادر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کا آغاز بالکل فطری انداز میں الاقرب فالاقرب کے اصول پر کیا۔ یعنی اپنے قریب ترین لوگوں سے آغاز کر کے آپ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جو پہلوں کے بعد قریب ترین تھے۔ سب سے پہلے آپ نے اپنی نئی ذمہ داری سے اپنی اہلیہ محترمہ، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو آگاہ کیا جو پہلے ہی سے آپ کے عقیدہ وعمل کی مداح اور آپ کی رسالت کی خبر کی منتظر تھیں، انھوں نے فی الفور آپ کی دعوت قبول کی۔ اس کے بعد یہ بات آپ کے باقی اہل خانہ کے علم میں آئی۔ ان میں سے آپ کی بیٹیوں زینب اور رقیہ اور آزاد کردہ غلام و متبنیٰ زید بن حارثہ نے اسلام قبول کیا۔ حضور کی تیسری اور چوتھی صاحب زادیاں ام کلثوم اور فاطمہ ابھی کم سن تھیں۔ قاضی سلیمان منصور پوری کی تحقیق کے مطابق تو حضرت فاطمہ کی ابھی ولادت نہیں ہوئی تھی اور حضرت علی، جو آں حضرت کی تولیت میں تھے، صرف آٹھ سال کے تھے اور ابھی سن شعور کو نہیں پہنچے تھے۔ بہر حال یہ صاحب زادیاں اور حضرت علی اسلام ہی کی آغوش میں پلے بڑھے اور سن شعور کو پہنچ کر انھوں نے اسلام ہی کو اوڑھنا بچھونا بنایا[۴]۔

گھر سے باہر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں، قدر دانوں اور مداحوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ آپ نے ان پر توجہ دی۔ جوں جوں وہ اسلام کی تعلیم کے قائل ہوتے گئے، نہ صرف خود حلقہ بگوش اسلام ہوئے، بلکہ اپنے اپنے اہل خانہ یا دوستوں کو بھی اس دین میں لانے کا ذریعہ بنے۔ ان کا تعلق قریش کے سبھی خاندانوں سے تھا۔ اس کا اندازہ سابقون اولون (یعنی شروع ہی میں ایمان لانے والوں) کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے جو سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے۔ ہم قریش کے خاندانوں کے حوالہ سے اسے یہاں نقل کرتے ہیں:

بنو ہاشم:	جعفر بن ابی طالب مع زوجہ اسماء بنت عمیس
بنو مطلب:	عبیدہ بن الحارث
بنو عبد شمس:	عثمان بن عفان
	خالد بن سعید بن العاص
	سلیط بن عمرو
	ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ
بنو اسد:	زبیر بن العوام

۴۔ سلیمان منصور پوری۔ رحمۃ للعالمین۔ ۸۱، ۱۲۳۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

	خدیجہ بنت خویلد	زوجۂ رسول اللہ
بنومخزوم:	ابوسلمہ بن عبدالاسد	
	عیاش بن ابی ربیعہ	مع زوجہ اسماء بنت سلامہ
	ارقم بن عبدمناف	
بنوتیم:	عبداللہ بن ابی قحافہ	(حضرت ابوبکر)
	طلحہ بن عبیداللہ	
	اسماء بنت ابی بکر	(حضرت عائشہ ابھی سن شعور کو نہیں پہنچی تھیں)
بنوزہرہ:	عبدالرحمٰن بن عوف	
	سعد بن ابی وقاص	وعمیر بن ابی وقاص
	خباب بن الارت	(حلیف)
	عبداللہ بن مسعود	(حلیف)
بنوعدی:	سعید بن زید	مع زوجہ فاطمہ بنت خطاب
بنوجمح:	عثمان بن مظعون وقدامہ بن مظعون وعبداللہ بن مظعون	
بنوسہم:	خنیس بن حذافہ	
بنواسد بن خزیمہ:	عبداللہ بن جحش وابواحمد بن جحش وزینب بنت جحش	
بنوحارث:	ابوعبیدہ بن الجراح	

ان کے علاوہ غلاموں میں عمار بن یاسر، یاسر مع زوجہ سمیہ، عامر بن فہیرہ اور صہیب بن سنان کے نام قدیم الاسلام صحابہ کے طور پر آتے ہیں۔ سیرت کی قدیم ترین کتابوں کے مطابق نبوت کے پانچویں سال تک مسلمانوں کی تعداد سوا سو سے زیادہ ہو چکی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بالکل ابتدا ہی میں قریش کے تمام خاندانوں کے اچھے افراد کو متاثر کر کے ان کے دلوں کو جیت لینے والی دعوت کیا خفیہ تھی اور اتنے لوگوں کا اسلام کیا مخفی رہ سکتا تھا کہ قریش کی لیڈر شپ کو تین سالوں تک کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ وہ اس آنے والے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوئی تدبیر کر سکتے۔

دوسرے زاویہ سے دیکھیں تو قریش کے خانوادے کوئی الگ الگ جزیرے نہ تھے کہ بنو ہاشم میں پیش آنے والا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ایک واقعہ بنو امیہ یا بنو اسد یا بنو مخزوم کے علم میں نہ آ سکتا۔ ان کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ آں حضرت کی پھوپھی ام الحکیم بیضاء بنو امیہ میں، پھوپھی صفیہ بنو اسد میں، پھوپھی برہ بنو مخزوم میں اور پھوپھی امیمہ بنو اسد بن خزیمہ میں بیاہی ہوئی تھیں۔ عثمان بن عفان بیضاء کے نواسے اور زبیر بن العوام حضرت خدیجہ کے بھتیجے اور صفیہ کے بیٹے تھے۔ جحش کے صاحب زادے امیمہ کی اولاد اور ابوسلمہ برہ کے بیٹے تھے۔ بنو زہرہ آں حضرت کے ننھیال اور بنو اسد آپ کے سسرال تھے۔ اتنی قریبی رشتہ داریوں میں باہمی تعلقات بے تکلف ہوتے ہیں، تمام لوگ ایک دوسرے کے احوال سے باخبر ہوتے ہیں اور کوئی بھی غیر معمولی واقعہ خفیہ نہیں رہ سکتا۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ہی تین سال تک کیسے خفیہ رہ گئی!

دعوت کو برداشت کرنے کا دور

ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ نہ صرف یہ کہ قریش کی لیڈرشپ کی نگاہوں کے سامنے ہو رہی تھی، بلکہ انھی کو مخاطب کیا جا رہا تھا، کیونکہ حضور کے عشیرہ وقبیلہ وہی تھے۔ لوگوں کے قبول اسلام کی رفتار بالکل فطری تھی۔ لوگ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے، آپ کا نقطۂ نظر معلوم کرتے اور جیسے جیسے دعوت کے معاملہ میں یکسو ہوتے قبول اسلام کی راہ میں کوئی چیز سد راہ نہیں بنتی تھی۔ آغاز کار میں بوجوہ قریش کے لیڈروں نے حضور کی مخالفت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا، بلکہ دعوت توحید کو برداشت کیا۔ اس لیے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ آں حضرت کی دعوت کا خفیہ دور تھا۔ قریش کے اس رویہ کے بظاہر تین اسباب سمجھ میں آتے ہیں:

اولاً: اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنے رسول پر ایک تدریج کے ساتھ نازل ہوا۔ ابتدا میں اس کا ہدف دلوں کے اندر نیکی کے فطری داعیہ کو ابھارنا اور معاشرتی برائیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنا تھا۔ اس میں خدا سے شکر گزاری کے تعلق، بندوں کے حقوق کے شعور، غربا پروری، مسکینوں کی دست گیری، یتیموں پر شفقت اور مکارم اخلاق کو تعلیم کا مرکزی نقطہ بنایا گیا تھا۔ مثال کے طور پر کچھ آیات ملاحظہ ہوں:

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ. وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا. وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا. (الفجر ۸۹: ۱۷-۲۰)	''ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے، مسکینوں کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے، وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کرتے اور مال کے عشق میں متوالے ہو۔''

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ. وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ. وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ. فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ. وَمَآ اَدْرٰكَ مَاالْعَقَبَةُ. فَكُّ رَقَبَةٍ. اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ. يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ. اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ. ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ. (البلد۹۰:۸-۱۷)

''کیا ہم نے (انسان) کو دو آنکھیں نہیں دیں، اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے، اور اس کو دونوں راہیں نہیں سجھا دیں؟ پر اس نے گھاٹی نہیں پار کی۔ اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھاٹی! گردن کو چھڑانا یا بھوک کے زمانہ میں کسی قرابت دار یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھلانا۔ پھر وہ بنے ان میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی۔''

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى. فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى. وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى. فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى. وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى. وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى. فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى. (اللیل۹۲:۴-۱۰)

''تمھاری سرگرمی کے ثمرات الگ الگ ہیں۔ سو جس نے انفاق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ مانا اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دیں گے کٹھن منزل کے لیے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

تمام اچھے اہل عرب ان اعلیٰ مقاصد کے ہمیشہ سے خوگر تھے جن کی تعلیم قرآن دے رہا تھا۔ اس تعلیم سے شرفاے قریش کے دلوں میں کوئی کھٹک نہیں پیدا ہوئی۔ انھوں نے اس دعوت کو ایک مقبول و ہر دلعزیز مصلح کی ایک قابل قدر سرگرمی قرار دیا۔

ثانیاً: قریش کے اندر دین حنیف کے ماننے والوں کی ایک روایت پہلے سے موجود تھی۔ ان لوگوں کی تعداد اگرچہ زیادہ نہ رہی ہو، لیکن یہ لوگ عین خانہ کعبہ کے سایہ میں اپنے عقائد کا برملا اظہار کرتے اور معاشرہ ان لوگوں کو برداشت کرتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حنیف تو تھے ہی، آپ معاشرے کے سب سے زیادہ باکردار، مکارم اخلاق کا پیکر، حسن عمل کا نمونہ، مجسم صداقت و امانت اور حق نصیحت ادا کرنے والے بھی تھے۔ قوم آپ کی قدردان اور آپ پر اعتماد کرتی تھی۔ آپ نے دین کی دعوت دینا شروع کی تو وہ آپ کے اسی کردار کو مزید نمایاں کرنے والی تھی۔ لہٰذا قریش کو ابتدا میں اس دعوت سے کوئی وحشت نہیں ہوئی۔ یہ اسی طرح کی صورت حال تھی جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد اور قوم کو بتوں کی پوجا سے منع کرتے رہے تو قوم ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ جب انھوں نے بتوں کو توڑ ڈالا اور بتوں کے پجاریوں نے قیاس آرائی شروع کی کہ یہ کارروائی کس شخص کی ہو سکتی ہے تو انھوں نے یقین

کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کا نام نہیں لیا، بلکہ محض گمان کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

سَمِعۡنَا فَتًی یَذۡکُرُہُمۡ یُقَالُ لَہٗۤ اِبۡرٰہِیۡمُ. ''ایک نوجوان کو، جس کا نام ابراہیم ہے، ہم نے ان بتوں کا (برا) ذکر کرتے سنا ہے۔'' (الانبیاء۲۱: ٦٠)

یعنی یہ شخص چونکہ بتوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار مخالفانہ انداز میں کرتا رہا ہے، لہٰذا ممکن ہے اسی نے یہ حرکت کی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جب وہ تقاضے سامنے آئے جن کی زد قریش کے مفادات پر پڑتی تھی اور انھیں اپنے مذہبی نظام میں دراڑیں پڑنے کا خطرہ محسوس ہوا تب انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے معاملہ میں رویہ تبدیل کیا۔

ثالثاً: عربوں کی زندگی قبائلی تھی۔ ہر خاندان اپنے افراد کا بہی خواہ اور محافظ ہوتا تھا۔ دوسرے قبائل اور خاندانوں کے لوگ کسی غیر خاندان کے فرد کو نقصان پہنچانے سے پہلے سو بار سوچتے تھے کہ اس فرد کے خاندان کے جذبۂ انتقام کو کیسے ٹھنڈا کریں گے اور ان کے نقصان کی تلافی کی کیا صورت ہوگی۔ قریش کے اندر جب اسلام قبول کرنے والوں پر تشدد کرنے اور دعوت دین کو زور وقوت سے کچل دینے کا خیال پیدا ہوا تو بار بار یہی سوال سامنے آتا رہا کہ متاثرین کے خاندانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت بھی کسی میں ہے یا نہیں۔ عرب قبائل میں اپنے افراد کا ساتھ دینے اور ان کے ساتھ زیادتی کا انتقام لینے کی روایت اس قدر مستحکم تھی کہ بعد میں جب یثرب کے قبائل اوس اور خزرج نے اسلام قبول کیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاں لے جانے کی پیشکش کی تو اس سے پہلے آپ سے یہ یقین دہانی حاصل کی کہ ان قبائل کے ان افراد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا جو یہودیت اختیار کر چکے ہیں۔ چنانچہ حضور نے ان یہودیوں کے وہی حقوق تسلیم کیے جو اسلام لانے والوں کے تسلیم کیے۔

www.javedahmadghamidi.com

قریش کو انذار کا حکم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کو برداشت کرنے کا یہ دور عارضی تھا۔ جلد ہی بیت اللہ کے متولیوں پر قرآن میں تنقید ہونے لگی اور ان کی کوتاہیوں کا پردہ چاک ہونے لگا تو ان کا رویہ بھی بدل گیا۔ انھوں نے رسول اللہ کی برملا مخالفت شروع کر دی اور دعوت کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگے۔ قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ملی کہ اپنے قرابت مند خاندان کو انذار کرو۔ انذار کا مطلب یہ تھا کہ ان کو خبردار کرو کہ وہ اپنی حرکتوں کو چھوڑ کر اسلام کی تعلیم کو قبول کریں ورنہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ کے لیے تیار رہیں، جس سے چھڑانے والا اور اللہ کے عذاب سے پناہ دینے والا

کوئی نہ ہوگا۔قرابت مند خاندان سے مراد بنو ہاشم ہی نہیں، بلکہ وہ تمام خاندان بھی تھے جن کا تعلق خانہ کعبہ کے نظم ونسق، اس کی حفاظت وخدمت اور مذہبی رسوم ادا کرانے سے تھا یعنی قریش کے تمام خانوادے۔ انذار کی ہدایت کا مقصد یہ تھا کہ اللہ کے گھر کے یہ متولی اور ناظمین اس سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی اصلاح کر کے دوسرے عربوں کے لیے قبول اسلام کی راہ کھولیں، کیونکہ دین کے معاملہ میں یہ ان کے مذہبی پیشوا ہیں۔ اگر یہ طبقہ کسی طرح دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے تو دوسرے لوگ بہ آسانی ان کی پیروی میں دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور جب تک یہ طبقہ دعوت کو قبول نہ کرے تو یہ عوام الناس کو اپنے مشوروں اور نصیحتوں کے ذریعے سے دعوت کی مخالفت اور بیخ کنی پر اکساتا رہتا ہے۔

یاد رہے کہ حضرت ابراہیم نے خانہ کعبہ اللہ واحد کی عبادت کے مرکز کے طور پر بنایا تھا اور اپنی اولاد کو اس میں نماز، طواف، اعتکاف، حج اور قربانی کی سہولتیں مہیا کرنے اور زائرین کی خدمت کرنے کا فریضہ سونپا تھا۔ لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ اولاد ابراہیم بیت اللہ کے اندر شرک کو تحفظ دینے اور توحید کی آواز دبانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اگر یہ لوگ حضور کی دعوت کو قبول کر لیتے تو بیت اللہ کے نظام کو اس کی اصل شکل میں قائم کرنا ممکن ہوتا جس کی آرزو ابراہیم نے کی تھی اور جس کے لیے درددل کے ساتھ دعائیں کی تھیں۔

قرآن کی مذکورہ ہدایت پر عمل کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہر ممکن طریقہ اختیار فرمایا وہیں عربوں میں مروج طریقہ بھی اپنایا۔ ان کے ہاں یہ روایت تھی کہ اپنے دشمنوں کی غارت گری سے محفوظ رہنے کے لیے وہ اپنی بستی کے قریب کسی ٹیلہ پر ایک دیدبان مقرر کر دیتے جو چاروں طرف نگاہ رکھتا۔ اگر دیدبان کبھی خطرہ محسوس کرتا تو 'یا صباحاہ' کا نعرہ بلند کرتا جس کا مطلب ہوتا کہ غارت گری کا خطرہ ہے۔ لوگ آواز سنتے ہی گھروں سے نکل کر بھاگتے ہوئے اس کے پاس آتے اور خطرہ کی نوعیت پوچھتے۔ اگر حملہ ہونے والا ہوتا تو وہ اپنے ہتھیار لگا کر میدان میں آ جاتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک صبح کوہ صفا پر کھڑے ہو کر یہی نعرہ لگایا تو لوگوں نے حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھا کہ یہ نعرہ کون لگا رہا ہے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز ہے تو قریش کے عام وخاص صفا کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں ایک نذیر (یعنی خطرہ سے خبردار کرنے والا) ہوں۔ میری اور تم لوگوں کی مثال اس آدمی کی ہے جو دشمن پر نظر رکھنے کے لیے اپنے قبیلہ کی دیدبانی کرتا ہے۔ پھر جب ڈرتا ہے کہ دشمن کہیں ان تک پہنچ نہ جائے تو 'یا صباحاہ' کا نعرہ بلند کر دیتا ہے۔ میں ایک آنے والے سخت عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ اے بنو کعب بن لوی، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو مرہ بن کعب،

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد شمس، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد مناف، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو ہاشم، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد المطلب، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ میں اللہ کے ہاں تمھارے لیے کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ البتہ تمھارے ساتھ میرا رحمی رشتہ ہے، سو میں اس کا حق ادا کرتا رہوں گا۔ اس موقع پر واحد آواز جو آپ کے خلاف اٹھی، وہ ابولہب کی تھی جس نے کہا: 'تبًّا لَکَ أَلِہٰذا دَعوتَنا' (غارت ہو، کیا اسی لیے تم نے ہمیں بلایا تھا؟[۵])۔

دوبارہ آپ نے انذار کی ہدایت پر عمل کرنے کی یہ تدبیر اختیار کی کہ تمام قرابت داروں کو کھانے پر بلایا۔ جب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ نے ان سے خطاب کر کے اپنی دعوت پیش کرنا چاہی، لیکن ابولہب آپ کی تقریر میں مخل ہو گیا اور لوگوں سے کہا کہ اب یہ شخص تم پر اپنا جادو چلانا چاہتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی منتشر ہو گئے۔ اس طرح حضور کو دعوت پیش کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برملا انذار کے مضمون کو عوام میں بیان کرنا شروع کر دیا جس سے قرشی لیڈر چیں بجبیں ہوئے۔

(جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ''حیات رسول امی'' سے انتخاب)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۵ صحیح مسلم۔ باب فی قولہ تعالیٰ وانذر عشیرتک الاقربین ۱۰۷-۱۰۹۔

محمد وسیم اختر مفتی

عمر فاروق رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۔۔۔۔ ۶ ۔۔۔۔

سیرت وعہد

انطاکیہ رومی سلطنت کا مشرقی دار الخلافہ تھا، یونانی، مسیحی اور رومی تمام ادوار میں یہ ایک اہم شہر رہا۔ وہاں بے شمار گرجے، بت خانے اور عمارتیں موجود تھیں۔ انطاکیہ کے لوگ ہی تھے جنھوں نے پہلی بار مسیحیوں کا لقب پایا، برنباس نے ان کے بیچ رہ کر اپنی تعلیمات کو فروغ دیا تھا۔ تیسری صدی عیسوی میں اس شہر کی آبادی ا لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ رومی بادشاہ اسے سمندر پار مصری دار السلطنت اسکندریہ پر ترجیح دیتے تھے۔ دریاے ارنط یہیں پر بحر روم میں گرتا تھا، ہر طرف سے سمندری جہاز یہاں پہنچتے، اس طرح یہ ایک اہم تجارتی منڈی بن گیا تھا۔ اس شہر کو ہر طرف سے بلند فصیلوں نے گھیر رکھا تھا۔ شام کی جنگوں کے بعد تمام رومی قوت یہاں مجتمع ہو چکی تھی، قیصر روم ہرقل، البتہ رہا میں مقیم رہا۔ فاروق اعظم اس شہر کی فتح کو بے حد اہمیت دیتے تھے، وہ اسی جستجو سے حضرت ابوعبیدہ کی مہم کی خبریں معلوم کرتے جس طرح جنگ قادسیہ میں سعد بن ابی وقاص کے بارے میں دریافت کرتے تھے۔ انطاکیہ کی فوج نے شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کیا، اسے شکست ہوئی اور شہر مسلمانوں کے محاصرے میں آ گیا۔ انھیں جزیہ دینے اور یہاں سے

جلاوطن ہونے کی شرائط مان کر صلح کرنا پڑی، لیکن جلد اس صلح سے مکر گئے۔ تب حضرت ابوعبیدہ نے عیاض بن غنم کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا، انھوں نے انطاکیہ کو زیر کر کے انھی شرطوں پر پھر سے صلح کی۔ ادھر حلب میں رومی فوجیں ایک بار پھر جمع تھیں۔ حضرت ابوعبیدہ وہاں پہنچے، ان کی جمعیت کو منتشر کیا پھر قورس اور منبج کو فتح کیا۔ انھوں نے حضرت خالد بن ولید کو مرعش بھیجا، جسے فتح کرنے کے بعد فرات تک ساری شامی سرزمین مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔ اس مرحلے پر یزید بن ابوسفیان نے دمشق سے جا کر بیروت اور اس کے آس پاس کا علاقہ فتح کیا۔ اب ہرقل رہا سے نکلا اور قسطنطنیہ کی راہ پکڑی۔ رستے میں ایک بلند گھاٹی پر کھڑا ہوا اور پکارا: سلام اے سوریہ، اب دوبارہ ملنا نہ ہوگا۔ بزنطیہ میں کچھ دن گزار کر وہ قسطنطنیہ میں مقیم ہو گیا، یہ ۶۳۶ء کا سن تھا۔ یہ وہی قیصر تھا جس نے صرف ۱۱ برس پہلے، ۶۲۵ء میں ایران کو شکست دے کر صلیب اعظم اور اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لیا تھا۔

اس موقع پر بنوغسان کے بادشاہ جبلہ بن ایہم نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو خط لکھا کہ وہ اور اس کی قوم اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ اپنے ۵۰۰ اہل خانہ کو لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرنے مدینہ پہنچا۔ کچھ روز مدینہ میں گزارنے کے بعد وہ اور خلیفۂ ثانی عمرہ کرنے بیت اللہ پہنچے، دوران طواف میں کسی فزاری نے اس کے پاجامے پر پاؤں رکھ دیا، اس نے پلٹ کر بنوفزارہ سے تعلق رکھنے والے اس شخص کی ناک کاٹ ڈالی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اس شخص کو راضی کرو، ورنہ قصاص دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جبلہ نے کہا: کیسا قصاص؟ یہ عامی ہے اور میں بادشاہ۔ اس نے کہا: میں دوبارہ عیسائی ہو جاتا ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تب تمھیں تلوار کا سامنا کرنا ہو گا۔ اس نے ایک رات کی مہلت مانگی اور اسی رات اپنے ہم سفروں کو لے کر شام روانہ ہو گیا۔ پھر وہ ہرقل کے پاس قسطنطنیہ گیا اور نصرانی مذہب اختیار کر لیا۔

مدائن کے شمال میں واقع تکریت کے شہر میں ایک ایرانی صوبے دار نے رومی فوجوں سے مدد لی اور ایاد، تغلب اور نمر کے عیسائی عرب قبائل کو اپنے ساتھ ملا لیا تو خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن معتم کو ۵ ہزار کا لشکر دے کر وہاں بھیجا۔ ۴۰ دن شہر کا محاصرہ جاری رہا، اس دوران میں عبداللہ نے ان عرب عیسائیوں کو اسلام کی دعوت دی اور انھیں مسلمانوں کے برابر حقوق دینے کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ شہر بند ہونے کا کوئی فائدہ نہ ہوا تو رومیوں نے عقبی دروازے سے کشتیوں میں بیٹھ کر شہر سے فرار ہونے کا ارادہ کیا۔ مسلمانوں کو ان کے ارادے کی خبر ہو چکی تھی، انھوں نے فوراً ان پر حملہ کر دیا۔ وہ بڑے دروازے کی طرف پلٹے تو عرب عیسائی ان پر پل پڑے۔ دشمن کے اکثر فوجی مارے گئے اور تکریت فتح ہو گیا۔ اب عبداللہ نے ربعی بن افکل کو موصل کی مہم پر بھیجا۔ انھوں نے وہاں

پہنچ کر نینوا اور موصل، دونوں قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ زیادہ دیر نہ گزری کہ یہاں کے رہنے والوں نے جزیہ دینے کی شرط پر صلح کر لی۔ تکریت سے ہر سوار کو ۳ ہزار درہم اور پیادہ کو ۱ ہزار درہم مال غنیمت حاصل ہوا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کو فرات کے کنارے پر واقع ایک اور شہر ہیت میں فوجوں کے اجتماع کا پتا چلا تو خلیفۂ ثانی کے حکم پر عمرو بن مالک کی کمان میں ایک لشکر وہاں بھیجا۔ انھوں نے دیکھا کہ اہل شہر قلعہ بند ہیں اور فصیل کے باہر خندق کھدی ہوئی ہے تو وہ حارث بن یزید کو وہاں چھوڑ کر قرقیسیا پہنچے اور اسے زیر کیا۔ ان کے پیچھے ہیت والوں نے ہتھیار ڈال دیے اور شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ اب ایران و عراق کے سرحدی شہر ماسبذان میں ایران کی فوجی قوتیں جمع تھیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے ضرار بن خطاب کی سربراہی میں ایک لشکر وہاں بھیجا، ماسبذان کے میدان میں ان کی ایرانی فوجوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ انھیں شکست دینے کے بعد ضرار نے ماسبذان شہر پر قبضہ کیا، وہاں کے باشندگان شہر خالی کر کے پہاڑوں پر جا چکے تھے۔ انھوں نے ان کو جزیہ ادا کر کے اطمینان سے اپنے گھروں میں واپس آنے پر آمادہ کیا۔ اسی اثنا میں امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب کی طرف سے جنوبی عراق کے لیے مقرر کردہ کمانڈر عتبہ بن غزوان کئی ہفتوں کی سخت جنگ کے بعد بصرہ کے قریب واقع ابلہ کی بندرگاہ فتح کر چکے تھے۔ وہاں کے ساکنان فرار ہو کر دست میسان پہنچے تو انھوں نے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس فتح کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عتبہ کو مدینہ طلب کیا، کیونکہ انھیں خیال ہوا کہ میری سپاہ دنیا کی حرص کرنے لگی ہے۔ عتبہ، مجاشع بن مسعود کو اپنا نائب بنا کر آئے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو سرزنش کی کہ صحابئ رسول یا قریشی کے ہوتے کسی دوسرے کو امارت نہ دی جائے، انھوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو امیر جیش مقرر کرنے کا حکم دیا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عراق سے آنے والے فوجیوں کی صحتیں خراب ہوتی دیکھیں تو اس کا سبب دریافت کیا۔ انھیں بتایا گیا کہ وہاں کی آب و ہوا عربوں کو موافق نہیں۔ ادھر حذیفہ بن یمان نے مدائن سے رپورٹ بھیجی، مسلمان فوجیوں کے پیٹ ساتھ لگ گئے ہیں، بازووں اور ٹانگوں سے گوشت اتر گیا ہے اور ان کے رنگ سیاہ ہو گئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہدایت بھیجی کہ یہاں کے لوگوں کو وہی آب و ہوا موافق ہو گی جو ان کے اونٹوں کے لیے سازگار ہو۔ انھیں دریاؤں سے دور ان خشک سرزمینوں میں آباد کرو، جہاں پینے کے چشمے بھی ہوں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے عبداللہ بن معتم اور قعقاع کو ایسی جگہ کے انتخاب کی ذمہ داری سونپی۔ ادھر مدینہ کے اہل رائے نے کوفہ کا مقام تجویز کیا جو فرات کے قریب ہونے کے باوجود صحرا سے دور نہیں۔ ۱۴ ہجری میں مدائن سے حضرت سعد آئے، سب سے بلند جگہ کی نشان دہی کر کے وہاں مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ خسروی محلات سے حاصل شدہ سنگ مرمر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کے ستونوں سے مسجد کی دوسو ہاتھ بلند چھت کھڑی کی گئی۔ ایک خندق کھود کر مسجد کی حدود مقرر کی گئیں۔ حضرت سعد نے بازار بنانے کے لیے مسجد کے گرداگرد ایک تیر کی مار کے برابر کھلا میدان چھوڑنے کا حکم دیا۔ ایک ایرانی معمار نے مسجد کے پڑوس میں ایران کے شاہی محلات میں استعمال ہونے والی اینٹوں سے ''قصر سعد'' تعمیر کیا، بیت المال بھی یہیں تھا۔ اس کے پاس فوجیوں کی کالونی بن گئی، ہر قبیلے نے اپنے لیے جگہ مقرر کر کے خیمے لگا لیے۔ اب حضرت سعد نے امیر المومنین کو مطلع کیا کہ میں نے حیرہ وفرات کے بیچ کوفہ میں قیام کر لیا ہے۔ مسلمان کوفہ و مدائن میں سے جس شہر میں رہنا چاہیں، رہ سکتے ہیں۔ کوفہ میں کچھ عرصہ گزرا تو فوجیوں کی صحتیں بحال ہو گئیں، انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نرکل کے گھر بنانے کی اجازت چاہی۔ جب یہ گھر بن گئے تو ان میں آگ لگ گئی، اب خلیفہ سے اینٹوں کے گھر تعمیر کرنے کی اجازت چاہی گئی، انھیں اجازت مل گئی، لیکن فاروق اعظم نے حکم دیا کہ ۳ کمروں سے زیادہ نہ بنائے جائیں اور اونچی عمارتیں کھڑی نہ کی جائیں۔ جب فتنہ پردازوں نے انھیں شکایت ارسال کی کہ حضرت سعد نماز صحیح طور پر ادا نہیں کرتے، انھوں نے اپنے نام پر ایک محل بنایا ہے، اس کے باہر ایک الگ دروازہ بنا کر اس پر پردہ لٹکا دیا ہے تو انھوں نے محمد بن مسلمہ کو تحقیقات کے لیے بھیجا۔ انھیں یہ دروازہ جلانے کا حکم تھا، جبکہ حضرت سعد کو ہدایت تھی کہ اس قصر کو خالی کر کے بیت المال کے قریب کسی کمرے میں مقیم ہو جاؤ، جہاں عام لوگوں کو روکنے کے لیے الگ دروازہ نہ ہو۔ محمد بن مسلمہ کوفہ پہنچے تو الزامات درست نہ پا کر لوٹ آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت سعد کو بے قصور مان لیا۔ کوفہ کے بعد ۱۸ ہجری میں بصرہ کی تعمیر ہوئی، اس کے لیے ابلّہ کے قریب دجلہ وفرات کے ڈیلٹا کا انتخاب کیا گیا، یہیں سے یہ دونوں دریا خلیج فارس میں گرتے ہیں۔ بلاذری کے خیال میں عتبہ بن غزوان نے ۱۴ ہجری میں کوفہ آباد ہونے سے پہلے امیر المومنین سے یہاں شہر بسانے کی اجازت چاہی۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پالیسی تھی کہ ایران و عراق کی مفتوحہ زمینیں کسانوں کے پاس رہیں، چاہے وہ اسلامی غلبے کے وقت اپنی زمینوں پر موجود رہے ہوں یا جنگ سے ڈر کر بھاگ گئے ہوں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے ان کسانوں کو ذمی قرار دیا۔ عوام الناس کی جائدادوں کے برعکس شاہی زمینیں اور جنگ میں حصہ لینے والے دہقانوں اور امرا کی زمینیں خلافت اسلامی کی ملکیت قرار دی گئیں، البتہ ان پر کام کرنے والے عراقی انھی سے غلہ حاصل کرتے۔ خراج، جزیہ اور ان زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدن سے فوجیوں، ان کے اہل خانہ اور دفاع کی دوسری ضروریات پوری کی جاتیں۔ فوجیوں کی خواہش تھی کہ مفتوحہ زمینیں بانٹ کر ان کی ملک میں دے دی جائیں۔ عمر رضی اللہ عنہ کا جواب تھا: اگر تمھاری طرف سے باہم قتل و غارت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم ایسا کر گزرتے۔ مزید برآں

ان کا یہ خیال تھا کہ فوجی اگر زمین داری میں لگ گئے تو اسلامی فوج کی ہیئت متاثر ہو گی۔ ابھی ایران و روم سے کشمکش اپنے انجام کو نہ پہنچی تھی، ویسے بھی کوئی مملکت فوج کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اب اہل بصرہ نے شکایت کی: اے امیر المومنین، کوفہ والے میٹھے پانی اور گھنے باغات سے مستفید ہو رہے ہیں، ہم کھارے سمندر اور بیابان کے بیچ ایک شور زمین میں آ پڑے ہیں، جہاں کھیتی ہے نہ مال، ہماری عورتیں پانی بھرنے چھ چھ میل دور جاتی ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے گورنر کوفہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کو ہدایت کی کہ بصرہ سے ۱۸ میل دور شمال میں بہتے ہوئے دجلہ سے نہر کھود کر بصرہ لائی جائے۔ انھوں نے باقی قابل زراعت زمین تک آب رسانی کا حکم بھی دیا۔ عراق میں موجود ایرانی انجینئروں نے جنگ کے دوران میں تباہ ہونے والی عمارتوں اور پلوں کو ازسر نو تعمیر کیا۔

جب اسلامی افواج کے سربراہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ حماص اور انطاکیہ کی مہموں کی سرکردگی کر رہے تھے، حضرت عمرو بن عاص اور حضرت شرحبیل بن حسنہ فلسطین میں رومی قوتوں کا سامنا کر رہے تھے۔ ہر طرح کے آلات حرب سے لیس یہ ایک بھاری فوج تھی، اس کی کمان ایک بڑے رومی جرنیل ارطبون (Tribunus) یا اطربون کے پاس تھی، جس نے رملہ، ایلیا، غزہ اور نابلس میں بڑی بڑی نفریاں متعین کر رکھی تھیں۔ حضرت عمرو بن عاص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مطلع کیا کہ اگر ہم اس لشکر کے ایک حصے پر حملہ کرتے ہیں تو یہ تمام اطراف سے یکجا ہو کر ہم پر حملہ آور ہو گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاویہ بن ابوسفیان کو قیساریہ فتح کرنے کی ہدایت کی۔ یہ سمندر کے پاس ایک قلعہ نما شہر تھا، یہاں بے شمار رومی فوجیں متعین تھیں اور سمندر کی طرف سے آنے والی کمک یہیں سے ہو کر آتی۔ معاویہ قیساریہ پہنچے اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ ایک طویل محاصرے کے بعد رومی فوج مقابلے کے لیے نکلی اور ۸۰ ہزار جانوں کا نذرانہ دے کر بھاگ نکلی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے غزہ کو زیر کیا۔ اس دوران میں ارطبون (اطربون) کی فوج نے اجنادین کی طرف حرکت شروع کی تو حضرت عمرو بن عاص نے اسے روکنے کے لیے علقمہ بن حکیم اور مسروق عکی کو ایلیا اور ابوایوب مالکی کو رملہ بھیجا۔ اس کے ساتھ انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مدد طلب کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم روم کے ارطبون (اطربون) کی طرف عرب کا ارطبون بھیجیں گے۔ حضرت عمرو بن عاص نے ان کی طرف سے آنے والی کمک کا کچھ حصہ ایلیا اور رملہ بھیج دیا اور باقی تمام فوج لے کر اجنادین کا رخ کیا، وہاں رومی خندقیں کھود کر قلعہ میں مامون بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عمرو بن عاص نے داخلے کے لیے حیلے سے کام لیا۔ پہلے صلح کی بات چیت کے لیے ایلچی بھیجے، لیکن جب ان سے اندرون کے بارے میں تسلی بخش معلومات نہ ملیں تو خود بھیس بدل کر قلعہ میں گئے۔ ارطبون (اطربون) کو شک ہو گیا کہ اسلامی فوج کا سپہ سالار خود

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یہاں موجود ہے، اس نے اپنے خصوصی دستے کے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ انھیں قلعہ سے واپس جاتے ہوئے قتل کر ڈالے۔ حضرت عمرو بن عاص کو اس کے ارادے کا فوراً احساس ہو گیا، انھوں نے ارطبون سے کہا: میں حضرت عمر بن خطاب کے ۱۰ خاص آدمیوں میں شامل ہوں جو انھوں نے اس جرنیل کے ساتھ بھیجے ہیں۔ میں اپنے باقی ساتھیوں کو بلا کر لاتا ہوں، اگر وہ بھی متفق ہو گئے تو تمام لشکر ہمارے سمجھوتے پر عمل پیرا ہو جائے گا۔ یوں وہ جان بچا کر نکلے، اب ان کا جنگی منصوبہ بھی تیار تھا۔ یہاں یرموک جیسی شدید جنگ ہوئی اور طرفین کا بہت جانی نقصان ہوا۔ مسلمان ثابت قدمی سے ڈٹے ہوئے تھے، لیکن رومیوں کا حال مختلف تھا۔ ایک دن جنگ میں وقفہ ہوا تو رومی کمانڈر ارطبون (اطربون) نے اپنی فوج پر تھکن کے آثار دیکھے، سپاہی پریشاں صف تھے۔ وہ گھسٹتا ہوا پیچھے کو مڑا، اس کا رخ بیت المقدس (ایلیا) کی جانب تھا۔ علقمہ اور مسروق نے اسے فوراً راستہ دے دیا تو وہ بیت المقدس میں داخل ہو گیا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے رفح، سبسطیہ، نابلس، عمواس اور یافا کے علاقوں پر قبضہ کر کے ارطبون کی سمندر کی طرف واپسی کی راہیں مسدود کر دیں۔ اب ایلیا اور رملہ دو مقامات رہ گئے تھے، جہاں مسلمان رومی افواج کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ ایلیا (بیت المقدس) قدیم زمانے سے ایک مضبوط قلعہ تھا، اس لیے مختلف اور متضاد روایتوں میں سے ایک یہی روایت قرین قیاس لگتی ہے کہ اسے فتح کرنے کے لیے مسلمانوں کو ایک طویل محاصرہ کرنا پڑا۔ حضرت خالد بن ولید اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح اس محاصرے میں شریک نہ تھے، اس لیے کہ وہ عین اس وقت (۱۵ھ، ۶۳۶ء) حمص اور انطاکیہ کی جنگوں میں مشغول تھے۔ بیت المقدس کے باسیوں کو یقین تھا کہ دوسرے شہروں کی طرح یہ شہر بھی ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اسی لیے وہاں کے لاٹ پادری صفرنیوس نے صلیب اعظم اور قیمتی مذہبی نوادرات سمندر کے راستے قسطنطنیہ کے بڑے گرجے ایا صوفیا میں رکھنے کے لیے بھیج دیے۔

محاصرے نے طول کھینچا تو حضرت عمرو بن عاص نے امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب کو خط لکھا کہ مجھے ایک دشوار ملک میں مشقتوں سے بھرپور جنگ کا سامنا ہے۔ اس سے پہلے ارطبون براہ راست حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ دھمکی آمیز چٹھی ارسال کر چکا تھا کہ لوٹ جاؤ، ورنہ شکست کا سامنا کرنا ہو گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں موجود اہل رائے کو حضرت عمرو بن عاص کا خط سنایا اور ایلیا جانے کے بارے میں مشورہ کیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے مدینہ ہی میں موجود رہنے کا سجھاؤ دیا، جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: بیت المقدس جانا بہتر ہے، اس سے وہاں پر موجود مسلمان مطمئن ہو جائیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی رائے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا، پہلے انھوں نے ایک لشکر بیت المقدس روانہ کیا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کر کے خود عازم سفر

ہوئے۔ان کے بیت المقدس (ایلیا) پہنچنے سے قبل ارطبون مصر کو کھسک چکا تھا اور بوڑھا پادری صفرنیوس شہر ان کے حوالے کرنے کو تیار تھا۔ فاروق اعظم مدینہ سے جابیہ پہنچے، یزید بن ابوسفیان، حضرت خالد بن ولید اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح ان سے ملاقات کرنے آئے۔ انھوں نے ان اصحاب رسول کو ریشمی لباس پہنے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا، گھوڑے سے اترے اور پتھر مار کر چلائے: تم اس ہیئت میں میرا استقبال کرنے آئے ہو۔ عذر پیش کیا گیا کہ امیر المومنین، یہ تو جنگ میں استعمال ہونے والی ایرانی قبائیں ہیں، اس وقت ہم پوری طرح اسلحے سے لیس ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ فرو ہوا، پھر انھوں نے ان سے صلاح مشورہ کیا۔ وہ جابیہ ہی میں تھے کہ صفرنیوس کے ایلچی ان سے معاہدۂ صلح کرنے آئے۔ اس صلح نامے میں تحریر تھا: ایلیا میں رہنے والوں کو جان و مال کی امان دی جاتی ہے، ان کے گرجوں کو گرایا جائے گا نہ ان کی صلیبوں کو منہدم کیا جائے گا، ان کے مذہبی معاملات میں کوئی زبردستی نہ ہوگی، انھیں جزیہ دینا ہوگا، یہ رومیوں کو اپنے شہر سے نکال دیں گے، جو ان کے ساتھ رہے گا، اسے بھی امان حاصل ہوگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاہدے پر دستخط کیے اور حضرت خالد بن ولید، حضرت عمرو بن عاص، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور معاویہ بن ابوسفیان نے گواہی دی۔

ایلیا کے بعد رملہ اور لد کے رہنے والوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ معاہدات صلح کیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے علقمہ بن حکیم کو رملہ کا اور علقمہ بن مجزز کو ایلیا کا عامل مقرر کیا۔ پھر وہ حضرت عمرو بن عاص اور حضرت شرحبیل بن حسنہ کی معیت میں بیت المقدس کو روانہ ہوئے۔ کچھ روایات کے مطابق حضرت ابوعبیدہ اور حضرت خالد بھی ان کے ساتھ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اونٹ پر سوار تھے، ایک غلام آپ کا ہم رکاب تھا، دونوں باری باری اونٹ پر سوار ہوتے۔ جب وہ بیت المقدس پہنچے تو غلام سوار تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مہار پکڑے ہوئے تھے۔ صفرنیوس اور دوسرے عمائدین شہر نے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوری طور پر محراب داؤد پہنچے، وہاں آیت سجدہ پڑھی اور سجدہ ادا کیا۔ رات انھوں نے شکرانے کے نفل ادا کرنے میں گزاری اور اپنے ساتھیوں کو فجر کی نماز پڑھانے کے بعد صفرنیوس کے ساتھ شہر کے آثار دیکھے۔ وہ کنیسۂ قیامت میں تھے کہ ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ صفرنیوس نے انھیں وہیں پر نماز ادا کرنے کی دعوت دی، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معذرت کر لی۔ انھوں نے کنیسۂ قسطنطین کے دروازے پر بھی نماز نہ پڑھی، جہاں ان کے لیے چادر بچھائی گئی تھی۔ وہ گرجوں سے دور ہیکل سلیمانی کی چٹان صخرۂ یعقوب کے پاس آئے اور وہاں نماز ادا کی، بعد میں اسی جگہ مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ تعمیر کی۔ عیسائیوں کی عبادت گاہوں میں نماز پڑھنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس لیے اجتناب کیا کہ مسلمان

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

انھیں مساجد میں نہ تبدیل کر ڈالیں۔ اگرچہ انھوں نے کنیسۂ مہد میں نماز پڑھ لی، لیکن بعد میں یہ تحریر لکھ کر دی: یہ گرجا نصاریٰ کا ہے، بیک وقت ایک سے زیادہ مسلمان اس میں داخل نہ ہوں گے۔ مشہور روایت کے مطابق بیت المقدس ۱۵ھ میں فتح ہوا، کچھ مورخین ۱۶ ہجری کا سن بتاتے ہیں۔ بیت المقدس سے واپسی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ دن جابیہ میں رہے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو حضرت علی اور دوسرے اصحاب رسول رضی اللہ عنہم نے ان کا استقبال کیا۔

مطالعۂ مزید: تاریخ الامم والملوک (طبری)، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)، الفاروق عمر (محمد حسین ہیکل)، تاریخ اسلام (اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طالب محسن

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

غلامی کا خاتمہ کیوں نہ ہو سکا؟

سوال: لونڈیوں کے خاتمے کی فوری یا بتدریج کوئی حد کیوں مقرر نہیں کی گئی؟ کوئی برائی اتنی دیر تک برداشت نہیں کی جا سکتی کہ تیرہ چودہ سو سال جاری رہے۔ (محمد عارف جان)

جواب: قرآن مجید میں نئے لونڈی اور غلام بنانے کی اجازت ختم کر دی گئی اور پرانے غلاموں کی آزادی کے لیے مکاتبت کا طریقہ رائج کر دیا۔ غلام آزاد کرنے کو ایک بڑی نیکی قرار دیا گیا۔ کئی گناہوں کے ضمن میں غلام آزاد کرنے کو کفارہ قرار دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے تھا کہ غلاموں کی وہ نسل ختم ہوتے ہی غلامی ختم ہو جاتی، لیکن معاملہ صرف اسلامی دنیا ہی کا نہیں تھا۔ ساری دنیا میں غلام بنانے کا سلسلہ جاری رہا۔ غلاموں کی نسلیں بھی اسی طرح غلامی قبول کیے رہیں۔ قرآن مجید کے احکامات نے اصل میں غلامی کا دروازہ ہی بند کر دیا تھا۔ یہ خارجی حالات ہیں جن کے باعث یہ مکروہ کاروبار جاری رہا۔

قرآن مجید نے موجود غلاموں کو بیک قلم آزاد اس لیے نہیں کیا کہ ہزاروں اور سینکڑوں لوگوں کی زندگیوں کا

معاملہ تھا۔ یہ آزادی ان لوگوں کے لیے رحمت کے بجائے شدید اذیت اور زحمت کا باعث ہوتی۔ آپ کی یہ خواہش کہ غلامی کے خاتمے کا کوئی وقت مقرر ہونا چاہیے تھا، ایک نیک خواہش ضرور ہے، لیکن جس معاشی سیٹ اپ کا سارا انحصار غلامی کے ادارے پر ہو اور آزادی کی صورت میں غلاموں کے لیے باعزت معیشت کی کوئی صورت موجود نہ ہو وہاں سیٹ اپ تبدیل کیے بغیر غلاموں کو آزادی دے دینا، ہزاروں لوگوں کو بے موت مار دینے کے مترادف ہے۔ اصل میں یہ مسلمان حکمرانوں کی غلطی ہے کہ وہ قرآن کی روح کو نہیں سمجھے اور جب وہ اس پوزیشن میں آئے کہ بین الاقوامی سطح پر اس مکروہ کاروبار کے سد باب کے لیے اقدامات کریں تو وہ اس کے شعور ہی سے عاری تھے۔ آپ نے یقیناً پڑھا ہوگا کہ ابراہیم لنکن کو غلامی کو عملاً ختم کرنے کے لیے جنگیں بھی لڑنی پڑی ہیں۔ یہ سعادت اگر مسلمان حاصل کرتے تو بہت اچھا ہوتا۔ اس سماجی برائی کی درستی کی جو راہ قرآن نے متعین کی تھی، غلامی کا خاتمہ اس کا یقینی نتیجہ تھا۔ لیکن عباسی اور عثمانی حکمران قرآن کے اس منشا سے آگاہ ہی نہیں تھے، غلامی کیسے ختم ہوتی۔

جمع قرآن کے متعلق آیات

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سوال: کیا قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت ہے جو یہ بات بیان کرتی ہو کہ جس ترتیب سے موجودہ قرآن مجید ہے اسی ترتیب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی مدون ہوا تھا؟

مزید براں آپ ان روایات پر بھی اپنی قیمتی رائے سے مستفیض فرمائیں جو قرآن مجید کے دو طرح سے مرتب ہونے کو بیان کرتی ہیں۔ ایک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مقرر کردہ کمیٹی کی ترتیب جس پر اب یہ قرآن مروج ہے۔ دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ترتیب جس میں انھوں نے زمانۂ نزول کے حوالے سے تاریخی ترتیب سے قرآن مرتب کیا تھا۔

اب جب میں قرآن مجید سے استفادہ کرتا ہوں تو مجھے نزولی ترتیب کی معلومات بہت مفید لگتی ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کسی حکم کے فلاں موقع پر نازل ہونے کی حکمت کیا تھی اور اس میں تدریج کے کیا پہلو پیش نظر تھے۔ (عاطف ارشد)

جواب: ہمارے نزدیک قرآن مجید جس ترتیب میں ہمارے ہاں موجود ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی ترتیب

سے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں اسے مرتب کر کے گئے تھے۔ یہ ترتیب اس انداز سے کی گئی ہے کہ اب اسے سمجھنے اور اس کی حکمتوں تک پہنچنے کے لیے کسی خارجی ذریعے کی ضرورت نہیں ہے۔ استاذ محترم نے اپنی کتاب ''اصول و مبادی'' میں اس حوالے سے لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سَنُقْرِؤُكَ فَلَا تَنسٰى إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى. (الاعلیٰ ۸۷: ۶-۷)

''عنقریب (اسے) ہم (پورا) تمھیں پڑھا دیں گے تو تم نہیں بھولو گے، مگر وہی جو اللہ چاہے گا۔ وہ بے شک، جانتا ہے اس کو بھی جو اس وقت (تمھارے) سامنے ہے اور اسے بھی جو (تم سے) چھپا ہوا ہے۔''

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ. إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ، فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ، ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ. (القیامہ ۷۵: ۱۶-۱۹)

''اس (قرآن) کو جلد پا لینے کے لیے، (اے پیغمبر)، اپنی زبان کو اس پر جلدی نہ چلاؤ۔ اس کو جمع کرنا اور سنانا، یہ سب ہماری ہی ذمہ داری ہے۔ اس لیے جب ہم اس کو پڑھ چکیں تو (ہماری) اس قرأت کی پیروی کرو۔ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے کہ (تمھارے لیے اگر کہیں ضرورت ہو تو) اس کی وضاحت کر دیں۔''

ان آیتوں میں قرآن کے نزول اور اس کی ترتیب و تدوین سے متعلق اللہ تعالیٰ کی جو اسکیم بیان ہوئی ہے، وہ یہ ہے:

اولاً، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے کہ حالات کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا کر کے یہ قرآن جس طرح آپ کو دیا جا رہا ہے، اس کے دینے کا صحیح طریقہ یہی ہے، لیکن اس سے آپ کو اس کی حفاظت اور جمع و ترتیب کے بارے میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی جو قرأت اس کے زمانۂ نزول میں اس وقت کی جا رہی ہے، اس کے بعد اس کی ایک دوسری قرأت ہو گی۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اس میں سے کوئی چیز اگر ختم کرنا چاہیں گے تو اسے ختم کرنے کے بعد یہ آپ کو اس طرح پڑھا دیں گے کہ اس میں کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا اور اپنی آخری صورت میں یہ بالکل محفوظ آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

ثانیاً، آپ کو بتایا گیا ہے کہ یہ دوسری قرأت قرآن کو جمع کر کے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دینے کے بعد کی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی آپ اس بات کے پابند ہو جائیں گے کہ آیندہ اسی قرأت کی پیروی کریں۔ اس

کے بعد اس سے پہلے کی قرأت کے مطابق اس کو پڑھنا آپ کے لیے جائز نہ ہوگا۔

ثالثاً، یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کے کسی حکم سے متعلق اگر شرح و وضاحت کی ضرورت ہوگی تو وہ بھی اس موقع پر کر دی جائے گی اور اس طرح یہ کتاب خود اس کے نازل کرنے والے ہی کی طرف سے جمع و ترتیب اور تفہیم و تبیین کے بعد ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے گی۔'' (۲۶)

اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ قرآن مجید جس شکل میں ہمارے سامنے ہے، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دی ہوئی ہے اور اب اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں ہے۔ دوسرے یہ بات بھی اس میں بیان ہو گئی ہے کہ تدریج اور حکمت جو کچھ بھی ہم کسی حکم کے بارے میں جاننا چاہیں وہ اس میں بیان کر دیا گیا ہے، اس کے لیے اب ہمیں کسی روایت یا شان نزول کی ضرورت نہیں ہے۔

باقی رہی وہ روایات جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف نزولی ترتیب سے قرآن مرتب کرنے کی نسبت کی گئی ہے، انھیں ہم قرآن کی محولہ بالا آیات کی روشنی میں رد کر سکتے ہیں۔ جب قرآن میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ترتیب کا پابند کر دیا گیا ہے تو حضرت علی کی طرف اس کی خلاف ورزی کی نسبت کس طرح قبول کی جا سکتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پیغمبر کے علاوہ وحی

سوال: کیا پیغمبر کے علاوہ بھی وحی آ سکتی ہے یا اس کی کوئی صورت نبی بنے بغیر کسی آدمی کو پیش آ سکتی ہے؟

(عرفان)

جواب: قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کہا گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینی رہنمائی کا سلسلہ بند کیا جا رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اب کسی شخص کو خدا کی طرف سے کسی دینی رہنمائی کے ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ جو لوگ اس طرح کے دعوے کرتے ہیں ان کی بات بالکل بے بنیاد ہے اور وہ شیطان کے بہکاوے میں آئے ہوئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا:

عن أبی هریرة رضی اللّٰه عنه قال: سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم	''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا

يقول: لم يبق من النبوة الا المبشرات. قالوا: وما المبشرات؟ قال: الرؤيا الصالحة. (بخاری، رقم ۶۵۸۹)

ہے کہ نبوت (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رابطے کے پہلو سے) مبشرات کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ لوگوں نے پوچھا: یہ مبشرات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: اچھا خواب۔''

اچھے خواب سے بھی دینی رہنمائی مراد نہیں لی جا سکتی، اس لیے کہ یہ معنی لینے کی صورت میں یہ روایت قرآن مجید کے خلاف چلی جائے گی۔

احمدیت کی سچائی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سوال: احمدیت تمام دنیا میں فروغ پا رہی ہے۔ کیا یہ اس کے سچا مذہب ہونے کی دلیل نہیں ہے؟

(عرفان)

جواب: دنیا میں کامیابی اگر حق ہونے کی دلیل ہے تو وہ پیغمبر جنھیں ان کی قوموں نے جھٹلا دیا اور چند نفوس کے سوا کسی نے ان کی بات نہ سنی ان کے بارے میں دوسری رائے قائم کرنا پڑے گی۔ دنیا میں فروغ کے اسباب دوسرے ہیں۔ ہمارے مسلمانوں میں شرک کی بعض صورتیں رائج ہیں اور ان کو ماننے والے اپنے آپ کو سواد اعظم کہتے ہیں۔ کیا ان کی یہ دلیل بھی درست ہے۔ اس وقت بھی عیسائی مذہب کے ماننے والے سب سے زیادہ ہیں اور انھیں دنیوی غلبہ بھی حاصل ہے۔ تثلیث کا عقیدہ ان کا بنیادی عقیدہ ہے۔ کیا یہ عقیدہ ان کی اس ترقی اور فروغ کی وجہ سے صحیح مان لیا جائے۔

حق صرف وہ ہے جسے قرآن حق قرار دے۔ خواہ اس بات کو ماننے والا آدمی دنیا میں ایک ہو اور اس کی بات کو ساری دنیا رد کر دے۔

وبائی امراض اور احادیث

سوال: کیا وبائی مرض کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہے۔ میں نے سنا ہے کہ

حضور نے فرمایا تھا: جو آدمی وبائی مرض کے علاقے میں ہو وہ اس علاقے کو نہ چھوڑے اور جو اس مرض سے فوت ہو گا، وہ شہید ہو گا۔ اس حدیث کی صحت کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ اس ضمن میں کچھ اور احادیث ہیں تو ان سے بھی آگاہ کیجیے۔ (فہد صدیقی)

جواب: آپ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ طاعون کے مرض کے حوالے سے ہے۔ یہ روایت متعدد کتب حدیث میں آئی ہے۔ میں یہاں بخاری سے ایک متن نقل کرتا ہوں:

عن سعد رضی اللّٰه عنه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم، قال: إذا سمعتم بالطاعون بأرض فلا تدخلوها وإذا وقع بأرض وأنتم بها فلا تخرجوا منها. (رقم ۵۳۹۶)

''حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی علاقے میں طاعون کے بارے میں سنو تو اس میں نہ جاؤ اور اگر کسی علاقے میں طاعون پھیل جائے اور تم اس میں ہو تو اس سے نہ نکلو۔''

اس حدیث کو بخاری اور مسلم، دونوں کی تصحیح حاصل ہے، لہٰذا سند کے اعتبار سے یہ ایک قوی حدیث ہے۔ اس حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اور ارشادات بھی کتب حدیث میں مروی ہیں، ہم ان میں سے دو یہاں نقل کر رہے ہیں۔ بخاری ہی میں ہے:

عن أبی هريرة رضی اللّٰه عنه يقول: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: لا عدوی، ولا طیرة، ولا هامة ولا صفر. وفر من المجذوم کما تفر من الأسد. (رقم ۵۳۸۰)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہ متعدی بیماری سے بیماری ہوتی ہے۔ نہ بدفال کوئی چیز ہے۔ نہ مقتول کی روح پیاسا پرندہ بنتی ہے اور نہ پیٹ میں بھوک لگانے کا کوئی جانور ہے۔ مجذوم سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو۔''

مسلم میں اس روایت کی پہلی بات پر ایک سوال اور آپ کا جواب بھی نقل ہوا ہے:

...فقال أعرابی: یا رسول اللّٰه، فما بال الإبل تکون فی الرمل کأنها الظباء. فیجیء البعیر الأجرب. فیدخل فیها. فیجربها کلها. قال: من أعدی

''...(آپ کی بات سن کر) ایک بدو نے پوچھا: ان اونٹوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو صحرا میں بالکل ہرنوں کی طرح صاف ہوتے ہیں۔ پھر ایک خارش زدہ اونٹ آتا ہے اور ان میں شامل ہو جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

الأول. (رقم ۲۲۲۰) اس طرح سب کو خارش زدہ کر دیتا ہے۔ آپ نے کہا:
یہ بتاؤ: پہلے کو کس نے خارش لگائی تھی۔''

اس سوال جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ متعدی بیماری بھی اللہ ہی کے اذن سے کسی کو لگتی ہے۔

اسلام اور تفریح

سوال: اسلام میں تفریح کا کیا تصور ہے۔ اس سے متعلق ایک چیز خوشی منانا بھی ہے۔ خوشی کیا چیز ہے۔ ہم اس کا اظہار کیسے کر سکتے ہیں یا اسے کیسے منا سکتے ہیں۔ کیا خوشی منانے پر کچھ قدغنیں عائد کی گئی ہیں۔ عید کے موقع پر دو رکعت نماز اور خیرات کی تعلیم کیا خوشی منانے کی دوسری صورتوں کی نفی کرتی ہے؟

(آفتاب احمد معروف)

جواب: اسلام اصل میں باطن اور ظاہر کی پاکیزگی کی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا پہننے، کھانے، پینے، رہنے بسنے، رسوم ورواج، تفریحات غرض ہر ہر دائرے اور موقع کے لیے اسلام فحاشی، منکرات اور محرمات سے گریز کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر خدا کے ایک بندے کی حیثیت کو بھی اس نے نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ دونوں عیدوں پر ایک اضافی نماز کو رائج کیا گیا ہے اور اسے خوشی کے اس دن کا نقطۂ آغاز بنا دیا ہے۔ عید الفطر میں صدقۂ فطر عائد کیا تاکہ غربا کے لیے عید کی خوشیوں میں شریک ہونے کی صورت پیدا ہو جائے۔ عید الاضحیٰ میں گوشت کی تقسیم سے یہی مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ ایک پہلو سے یہ دونوں عبادتیں خدا سے جوڑتی ہیں اور دوسرے پہلو سے انسان سے۔ فحاشی، منکرات اور محرمات سے گریز انسان کے اخلاقی وجود کو مفاسد سے محفوظ رکھتا ہے اور عبادت اور خیرات سے اسے قوت اور جلا حاصل ہوتی ہے۔

اسلام نے تفریحات پر پابندی عائد نہیں کی، بلکہ انھیں صحیح رخ پر استوار کر دیا ہے۔ جائز حدود میں رہ کر خوشی منائی جا سکتی ہے، لیکن اسے ایسی صورت نہیں دینی چاہیے جو انسان کے اخلاقی وجود کے لیے غلاظت اور زوال کا ذریعہ ہو۔

ترکے کی تقسیم

سوال: درج ذیل سوالات کے جواب عنایت فرمایے:

۱۔مرحوم بیٹے کے ورثہ کی تقسیم کیا ہوگی، جبکہ اس کے والدین، بیوی اور بچے زندہ ہوں۔

۲۔مرحوم بیٹے کے ورثہ کی تقسیم کیا ہوگی، جبکہ اس کی ماں، بیوی اور بچے زندہ ہوں۔

۳۔مرحوم بیوی کے ورثہ کی تقسیم کیا ہوگی، جبکہ اس کا شوہر اور بچے زندہ ہوں۔ (عمران عظیم)

جواب: پہلی صورت میں مرحوم کے ورثا تین ہیں۔ والدین، بیوی اور بچے۔ہم نے یہ مان لیا ہے کہ بچے کا لفظ صرف لڑکیوں کے لیے نہیں بولا گیا اور اس میں لڑکے اور لڑکیاں، دونوں شامل ہیں۔ میت پر کوئی قرض نہیں تھا اور نہ اس نے کوئی وصیت کی تھی۔ اب ہمارے نزدیک سب سے پہلے والدین اور بیوی کا حصہ نکالا جائے گا۔ والدین میں سے ہر ایک کو کل ورثے کا چھٹا حصہ دے دیا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر ترکہ ۷۲ روپے تھا تو والد کو بھی بارہ روپے ملیں گے اور والدہ کو بھی بارہ روپے دیے جائیں گے۔ بیوی کو کل ترکے کا آٹھواں حصہ دیا جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ بیوی کو ۷۲ میں سے نو روپے دیے جائیں گے۔ باقی بچنے والے روپے بچوں کو اس طرح دیے جاتے ہیں کہ بیٹی سے بیٹے کا حصہ دگنا ہو۔ ہماری مثال کے مطابق ۷۲ میں ۲۴ والدین کو اور ۹ روپے بیوی کو دینے کے بعد ۳۹ روپے بچے ہیں۔ اب اگر ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے تو بیٹی کو ۱۳ روپے اور بیٹے کو ۲۶ روپے ملیں گے۔

دوسری صورت میں بھی وہی تین ہی وارث ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ والدین میں سے والد موجود نہیں ہیں۔ قاعدہ وہی ہے۔ پہلے والدہ کو کل ترکے کا چھٹا حصہ اور پھر بیوی کو آٹھواں حصہ دینے کے بعد باقی رقم بچوں میں مذکورہ طریقے کے مطابق تقسیم ہوگی۔ ۷۲ میں سے ۱۲ روپے والدہ کو اور نو روپے بیوی کو ادا کرنے کے بعد باقی ۵۱ روپے بچیں گے۔ اوپر والی مثال کے مطابق اگر ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے تو بیٹے کو ۳۴ روپے اور بیٹی کو ۱۷ روپے دیے جائیں گے۔

تیسری صورت میں مرنے والی بیوی ہے اور اس کا ترکہ شوہر اور بچوں میں تقسیم ہونا ہے۔ بیوی کی اگر اولاد ہو تو شوہر کا حصہ ترکے کا چوتھائی ہے۔ باقی ترکہ بچوں میں مذکورہ قاعدے کے مطابق تقسیم ہونا ہے۔ ۷۲ میں سے ۱۸ روپے شوہر کو ملیں گے اور باقی بچنے والے ۵۴ روپے میں سے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی صورت میں ۱۸ روپے بیٹی کو اور ۳۶ روپے بیٹے کو دیے جائیں گے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طلاق کی عدت کا آغاز

سوال: میری شادی کو چھ سال ہوئے ہیں۔ اس دوران میں کئی بار جھگڑے ہوئے ہیں اور میری بیوی بار بار روٹھ کر میکے جاتی رہتی ہے۔ اب بھی آٹھ ماہ سے وہ میکے میں ہے۔ اس سے پہلے بھی میں نے ایک رجعی طلاق دی تھی جس کے بعد رجوع بھی کر لیا تھا۔ اب بھی منانے کی کئی کوششیں ہوئی ہیں۔ لیکن ان کی طرف سے طلاق کے بار بار اصرار پر میں نے ایک طلاق کا نوٹس بھیجا تھا۔ جس میں دس دن کے بعد دوسری طلاق واقع ہو جاتی اور تیس دن گزرنے پر تیسری طلاق واقع ہو جاتی۔ تیس دن گزرنے سے پہلے میں نے تیسری طلاق واقع ہونے کی شق ختم کر دی۔ آپ یہ بتائیے کہ دوسری طلاق کب واقع ہوئی اور اس کی عدت کیا ہے؟ یہ بھی بتائیے کہ کیا اس عدت میں رجوع ہو سکتا ہے؟ (عبداللہ)

جواب: آپ کے خط میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، وہ آپ کا بیان ہے۔ اگر فریقین میں نزاع ہو تو کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دونوں فریقین کے بیانات لیے جائیں اور وہ شخص فیصلہ سنائے جسے دونوں فریق بطور ثالث قبول کر چکے ہوں۔ آپ کے خط کو میں ایک علمی سوال کی حیثیت سے لے رہا ہوں اور اس میں آپ کی بیان کردہ صورت کو بھی جواب دینے کے لیے درست تسلیم کر رہا ہوں۔ لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ اس جواب کو ایک علمی رائے سمجھ کر پڑھیں۔

میرے نزدیک نوٹس بھیجنے کے دسویں دن دوسری طلاق کی عدت شروع ہو گئی تھی۔ تیسرے حیض تک آپ رجوع کر سکتے اور آپ کی اہلیہ واپس آ سکتی ہیں۔ یہ صرف تیسری طلاق کی عدت ہے جس میں رجوع نہیں ہو سکتا۔ آپ کے پاس دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ دوسری طلاق سے رجوع کر لیں اور اس کے لیے بھی زبانی بات چیت کے بجائے آپ اسی طرح تحریری نوٹس بھیجیں۔ اس صورت میں طلاق ختم ہو جائے گی اور آپ جب چاہیں گے صلح کر سکتے ہیں۔ خواہ اس میں کئی مہینے لگ جائیں۔ دوسری یہ کہ آپ عدت گزرنے دیں۔ عدت گزرتے ہی آپ کی بیوی آزاد ہوگی، وہ چاہے تو کسی اور سے نکاح کر لے یا آپ ہی سے دوبارہ نکاح کر لے۔

یہاں میں قرآن مجید کی ایک ہدایت کی یاد دہانی بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ طلاق دینے کے بعد بیوی کا جہیز کا سامان ہو یا آپ کی طرف سے دیے ہوئے تحائف ہوں انھیں فراخ دلی کے ساتھ بیوی کو لے جانے دینا چاہیے۔ یہ بات اگر آپ کے لیے قابل قبول نہ ہو تو بیوی کی رضامندی سے آپ کچھ چیزیں روک سکتے ہیں۔ اس معاملے میں زبردستی کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net